اقبال کا فلسفہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ایک مفکر کی حیثیت سے اقبال نے جن تصورات کو پیش کیا ہے ان کا سر چشمہ صرف ایک تصور ہے جسے اقبال نے ''خودی،، کا نام دیا ہے۔ اقبال کے تمام حکیمانہ تصورات اسی تصور سے ماخوذ ہیں اور اس سے ایک علمی اور عقلی تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمام تصورات خود ایک دوسرے کے ساتھ بھی ایک علمی اور عقلی رشتہ میں منسلک ہیں اور اقبال کا فکر ایک ایسے نظام حکمت کی صورت میں ہے جسکا ہر تصور دوسرے تمام تصورات سے علمی اور عقلی تائید اور توثیق حاصل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جبتک ہم اس نظام کے مرکز یعنی تصور خودی کو ٹھیک طرح سے نہ سمجھیں ہم اقبال کے کسی تصور کو بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اور اسکے برعکس جب تک ہم اقبال کے ہر تصور کو جو اسکے نزدیک تصور خودی کے حاصلات یا مضمرات میں سے ہے ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ لیں ہم خودی کے تصور کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ گویا اقبال کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسکے افکار کو الگ الگ کرکے اپنے غور و فکر کا موضوع نہ بنائیں بلکہ اسکے پورے فکر کا مطالعہ ایک کل یا وحدت کی حیثیت سے کریں۔

ظاہر ہے کہ جب اقبال کا ہر تصور ایک پورے نظام فکر کا جزو ہے اور یہ پورا نظام فکر اس کی تشریح اور تفہیم کرتا ہے تو ہم اسے اس نظام کے جزو کی حیثیت سے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے جدا کرکے نہیں سمجھ سکتے اور نہ ہی اس نظام کے کسی پہلو کو نظر انداز کرکے یا حذف کرکے یا غیر ضروری قرار دیکر سمجھ سکتے ہیں۔ جب تک ہم اقبال کے کسی تصور کو اسکے پورے نظام فکر کی روشنی میں اور اس کے باقی ماندہ تمام تصورات کی مدد سے نہ سمجھیں وہ ہمارا اپنا پسندیدہ تصور ہو تو ہو اقبال کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اقبال کا تصور تو وہی ہوسکتا ہے جس کی ماہیت اسکے پورے نظام فکر نے معین کی ہو۔ جب ہم ایک نظام فکر کے کسی جزو کو اس سے الگ کردیں تو وہ اسی طرح سے مردہ ہوجاتا ہے جس طرح کہ جسم حیوانی کا ایک عضو جب جسم سے کاٹ دیا جائے تو مردہ ہو جاتا ہے۔ یہ اصول فہم اقبال کے لئے ایک کلید کا درجہ رکھتا ہے۔ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں یا اقبال پر لکھنے والوں میں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، آج

اقبال کے نظریات کے بارے میں جسقدر غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جسقدر مباحثے یا اختلافات موجود ہیں یا جسقدر ان نظریات کو نادانستہ طور پر اپنے اپنے خیالات کی تائید کے لئے استعمال کرنے کی غلط کوششیں کی جارہی ہیں ان سب کا باعث یہی ہے کہ انہوں نے اس اصول کو مد نظر نہیں رکھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود فکر یا حکمت کی نوعیت کیا ہے؟ اور ہمیں اسکی ضرورت کیا ہے؟ اور پھر اقبال کا فکر ایک نظام حکمت کی صورت میں کیوں ہے؟ اقبال نے ایک ہی حقیقت پر اپنے تمام افکار کی بنیاد کیوں رکھی ہے؟ کیا اقبال کا یہ طرز عمل ضروری تھا یا محض اتفاق ہے؟ ہم شاید اس سوال کو نظرانداز کر سکتے تھے لیکن فکر اقبال کی تشریح کے لئے اس سوال کو اٹھانا اور اسکا جواب دینا ضروری ہے۔

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے وہ برابر اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ جس کائنات میں اچانک وہ آ نکلا ہے اسکی حقیقت معلوم کرے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جب تک اسے کائنات کی حقیقت معلوم نہ ہو وہ جان نہیں سکتا کہ خود اس کی حقیقت کیا ہے اور کائنات کے ساتھ اسکا تعلق کیا ہے۔ کائنات کی حقیقت سے اسے اپنی حقیقت کا سراغ ملتا ہے کیونکہ وہ خود بھی کائنات کا ایک اہم جزو ہے اور اپنی حقیقت وہ اس لئے جاننا چاہتا ہے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ اسکی زندگی کا اصلی مقصد کیا ہے اور وہ اپنی عملی زندگی کی تشکیل اور تعمیر کسطرح سے کرے کہ اس سے اپنے لئے اس دنیا میں یا کسی اگلی دنیا میں (اگر وہ بھی ہوتو) بہترین قسم کے نتائج و ثمرات حاصل کرسکے۔ وہ جاننا ہے کہ اگر وہ کائنات کے متعلق ہر قسم کے ممکن سوالات کا تسلی بخش جواب حاصل کرلیگا تو اسے اپنے آپ کے متعلق بھی ہر قسم کے سوالات کا تسلی بخش جواب مل جائیگا اور پھر وہ اس جواب کی روشنی میں اپنے تمام مسائل کا صحیح حل معلوم کرسکیگا اور اپنی زندگی کا استعمال صحیح طریق سے کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی حقیقت کا جو تصور بھی وہ قائم کرتا ہے اپنی عملی زندگی کو نہایت احتیاط کے ساتھ اسکے مطابق بناتا ہے۔ گویا اسکے لئے حقیقت کائنات کی تلاش نہ تو کوئی تفریحی مشغلہ ہے اور نہ ہی کوئی علمی یا نظری مسئلہ، بلکہ ایک شدید عملی ضرورت ہے جسکی اچھی یا بری تشفی اسکی روز مرہ کی زندگی کی تمام چھوٹی بڑی تفصیلات کو معین کرتی ہے۔

یہ غلط ہے کہ حقیقت کائنات کے تصورات یا نظریات حکماء یا فلاسفہ سے مخصوص ہوتے ہیں۔ در اصل آج تک کوئی تندرست فرد بشر جاہل یا عالم ایسا نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے جو حقیقت کائنات کا کوئی اچھا یا

برا صحیح یا غلط، جاهلانه یا عالمانه، مختصر یا مفصل، منظم یا غیر منظم تصور نه رکھے اور اپنی ساری عملی زندگی کو اس کے مطابق نہ بنائے ۔ حکماء یا فلاسفه صرف وہ لوگ ھیں جو اور لوگوں کی نسبت زیادہ ذھین اور باریک بین ھوتے ھیں اور اپنے ذوق اور اپنی افتاد طبیعت کے لحاظ سے حقیقت کائنات کے مسئلہ پر غور و خوض کرنے اور اسکو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے زیادہ موزوں اور مستعد ھوتے ھیں جس طرح سے بعض افراد عام لوگوں کے لئے غلہ پیدا کرنے میں یا کپڑا بننے میں یا اور ضرورت کی چیزیں بہم پہنچانے میں لگے رھتے ھیں اسی طرح نوع بشر کے حکماء و فلاسفہ عام لوگوں کی سب سے بڑی ذھنی یا روحانی ضرورت کی چیزیعنی حقیقت کائنات کا صحیح تصور بہم پہنچانے میں لگے رھتے ھیں۔ انکی کوشش یہ ھوتی ھے کہ حقیقت کائنات کے متعلق خود انکا اور دوسرے لوگوں کا تصور زیادہ سے زیادہ صحیح ھو تاکہ وہ خود اور دوسرے لوگ اپنی عملی زندگی کو زیادہ سے زیادہ صحیح بنا سکیں ۔ لیکن حقیقت کائنات کے تصور کی ضرورت ھر انسان کے لئے اسقدر شدید اور ناقابل التواء ھوتی ھے کہ لوگ کبھی فلسفیوں اور حکیموں کی تحقیق و تجسس کے ایسے نتائج کا انتظار نہیں کرتے جو آئندہ دستیاب ھونے والے ھوں اور جو نظریات پہلے ھی موجود ھوتے ھیں ان میں سے کوئی نظریہ قبول کرکے اس پر عمل درآمد شروع کر دیتے ھیں ۔ اور وھی نظریہ اپنی اولادوں کو وراثت میں سونپ جاتے ھیں ۔ لیکن اگر بعد میں آنے والی نسلیں کسی فلسفی کے نظریہ سے متاثر ھو جائیں تو اپنے نظریہ کو بدل لیتی ھیں ۔ تاریخ کے اکثر بڑے بڑے انقلابات فلسفیوں، حکیموں اور داناؤں کے فکر کی پیداوار ھیں—

حکماء اور فلاسفہ ھر دور میں پیدا ھوتے رھتے ھیں اور ان میں سے جو بعد میں آتے ھیں اپنے متقدمین کے فکر کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے رھتے ھیں۔ اس طرح سے ان کے اختلافات کا سلسلہ جاری رھتا ھے ۔ اگرچہ فلسفیوں اور حکیموں کا گروہ آج تک حقیقت کائنات کا صحیح تصور پیش کرنے سے قاصر رھا ھے تاھم جب سے اس گروہ نے حقیقت عالم پر غور و فکر شروع کیا ھے اس وقت سے لیکر آج تک ایک پر اسرار وجدانی شہادت کی بنا پر اس بات کا پختہ یقین ان پر غالب رھا ھے کہ کائنات ایک یکساں کل یا وحدت ھے یعنی وہ فاصلہ اور وقت دونوں کے لحاظ سے ایسے منطقوں یا حصوں میں بٹی ھوئی نہیں جن میں متضاد قسم کے قوانین قدرت جاری ھوں ۔ کائنات کے قوانین مسلسل اور مستقل ھیں ۔ وہ نہ صرف ھر جگہ ایک ھی ھیں بلکہ ھر زمانہ میں بھی ایک ھی رھتے ھیں ۔ وحدت عالم کا یہ فطری اعتقاد تمام بڑے بڑے حکیموں، فلسفیوں اور سائنسدانوں کے فکر میں خواہ وہ تصور پرست ھوں یا مادہ پرست ایک قدر مشترک کا حکم رکھتا ھے۔ اگرچہ کوئی بڑا فلسفی یا سائنسداں اسکی صحت کی دلیل طلب نہیں کرتا بلکہ

33300

آغاز ھی سے اسے اپنے مسلمات میں شمار کرتا ھے تاھم اسکی صحت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ھوگی کہ وہ آج تک غلط ثابت نہیں ھو سکا۔ سائنس اور فلسفہ کی تمام ترقیات جو اب تک وجود میں آئی ھیں ان کی بنیاد یہی حقیقت ھے اور وہ سب ملکر اسکی صحت کی شہادت دیتی ھیں اور سچ بات تو یہ ھے کہ اگر جویان حق و صداقت اور طالبان علم و حقیقت اس عقیدہ سے آغاز نہ کرتے اور یہ عقیدہ صحیح نہ ھوتا کہ کائنات ایک وحدت ھے اور اسکی تعمیر کے اندر ایک تسلسل موجود ھے جو کہیں نہیں ٹوٹتا، تو سائنس اور فلسفہ دونوں ممکن نہ ھوتے، یہی وہ عقیدہ ھے جو سائنسدان اور فلسفی دونوں کو اپنے اپنے دائرہ میں علمی تحقیق کے لئے اکساتا ھے اور اسی کی تصدیق سے وہ اپنی علمی تحقیق کے نتائج پر مطمئن ھوتا ھے اور اسکی راہ پر آگے قدم اٹھاتا ھے۔ ظاھر ھے کہ اگر فلسفی یا سائنسداں کومعلوم ھو جائے کہ جو علمی حقیقت (Scientific fact) اس نے دریافت کی ھے وہ محض وقتی اور مقامی ھے اور اسکی متبادل یا متوازی علمی حقیقتیں (Scientific Facts) اس کائنات میں بہت سی ھیں یا آئندہ ھو سکتی ھیں تو وہ اپنی تحقیق کے اس نتیجہ کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیگا۔ مذھبی رجحان رکھنے والے ایک انسان کے لئے تو وحدت عالم کا عقیدہ ناگزیر ھے کیونکہ وہ سمجھتا ھے کہ کائنات کا خالق ایک ھی ھے اور اسی کا مقصد پوری کائنات میں کار فرما ھے۔ اسی طرح سے ایک تصور پرست فلسفی کا حکیمانہ زاویہ نگاہ بھی اس عقیدہ کا تقاضا کرتا ھے لیکن یہ بات معنی خیز ھے کہ حکمائے مادیین بھی اس عقیدہ سے پہلو تھی نہیں کر سکے۔

وحدت کائنات کا مسئلہ ھمیں کئی نتائج کی طرف راہ نمائی کرتا ھے:۔

اول۔ کسی کثرت کے اندر وحدت کا ھونا نظم کے بغیر ممکن نہیں اور نظم ایک مرکزی اصول کے بغیر محال ھے لہذا کوئی تصور ایسا ھونا چاھئے جو کائنات کی وحدت کا اصول ھو۔ جو ایک ایسے رشتہ کی طرح ھو جو کائنات کی کثرت کو پرو کر ایک وحدت بناتا ھو۔

دوم۔ کائنات کی وحدت کے اصول کو کائنات کی آخری اور بنیادی حقیقت ھونا چاھئے۔ اور باقی تمام حقائق عالم کو اس کے مظاھر۔ کیونکہ اگر وہ اس حقیقت کے مظاھر نہ ھوں تو وہ ان میں اتحاد و نظم پیدا نہیں کر سکتی اور نہ ھی وہ حقائق اپنی فطرت کے اختلافات کی وجہ سے اس قابل رھتے ھیں کہ ان میں اتحاد یا نظم پیدا کیا جا سکے۔

سوم — کائنات کی وحدت بطور وحدت کے عقلی طور پر سمجھ میں آنی چاھئے لہذا ضروری ھے کہ تمام حقائق عالم کائنات کی بنیادی حقیقت کے ساتھ اور

ایک دوسرے کے ساتھ عقلی طور پر وابستہ ہوں اور اس باہمی وابستگی کے سبب سے ایک ایسی زنجیر کی صورت اختیار کریں جنکا پہلا اور آخری حلقہ کائنات کی وہی بنیادی حقیقت ہو اور جسکے تمام حلقے ایسے ہوں کہ ہر حلقہ اگلے حلقہ کی طرف راہنمائی کر رہا ہو۔ حکماء حقائق عالم کی ایک ایسی ہی زنجیر کو نظام حکمت (Philosophical System) کا نام دیتے ہیں۔

چہارم۔ اگر ہم حقائق عالم میں سے کسی حقیقت کی علت بیان کریں تو وہ علت اس حقیقت کی تشریح تو کر دیتی ہے لیکن خود کئی سوالات پیدا کردیتی ہے اور پھر ان سوالات کا جواب اور سوالات پیدا کرتا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر کائنات کو ایک وحدت مانا جائے تو ضروری ہے کہ ان پے در پے نمودار ہونے والے سوالات کا آخری جواب اور ہر حقیقت کی آخری تشریح کائنات کی اسی حقیقت کی فطرت ہو جو حقیقت الحقائق ہے۔

پنجم۔ اصول وحدت کائنات یا حقیقت کائنات کے ہزاروں تصورات ممکن ہیں لیکن ان میں صحیح تصور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ دو یا دو سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو کائنات کی وحدت ختم ہو جاتی ہے اور ضروری ہے کہ کائنات کے تمام صحیح اور سچے حقائق صرف اسی ایک تصور کے ساتھ عقلی اور علمی مناسبت رکھیں اور اسی کے ساتھ علمی اور عقلی لحاظ سے وابستہ ہوں اور حقیقت کائنات کے کسی دوسرے غلط تصور کے ساتھ مطابقت نہ کر سکیں اور جب کائنات کا صحیح نظام حکمت وجود میں آئے تو اسکا بنیادی یا مرکزی نکتہ یہی صحیح تصور ہو۔ اگر کوئی ایک سچی علمی حقیقت بھی ایسی ہو جو کسی نظام حکمت کے ساتھ مطابقت نہ رکھے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ وہ نظام حکمت کسی غلط تصور حقیقت پر مبنی ہے اور اگر کوئی علمی حقیقت جسے علمی حقیقت سمجھا جارہا ہو کسی صحیح نظام حکمت کے ساتھ جو صحیح تصور حقیقت پرمبنی ہو، مطابقت نہ رکھے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ وہ علمی حقیقت علم اور عقل کے معیاروں پر پوری نہ اتر سکے گی۔ غلط تصورات صحیح نظام حکمت کے اندر نہیں سما سکتے اور صحیح تصورات غلط نظام حکمت کے اندر داخل نہیں ہو سکتے لیکن صحیح نظام حکمت ہر دور میں تمام صحیح تصورات کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہی اسکی صحت کا معیار ہے۔

ششم۔ وحدت کائنات حقائق عالم کی عقلی ترتیب و تنظیم کو چاہتی ہے اور یہ ترتیب و تنظیم ہمارے معلوم اور نا معلوم حقائق کے درمیان ایک رابطہ یا کشش پیدا کرتی ہے اور ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم معلوم حقائق کی مدد سے

نا معلوم حقائق کو پیہم دریافت کرتے چلے جائیں ۔ یہاں تک کہ حقائق عالم کے سلسلہ کی ساری کڑیاں اپنی اصلی عقلی ترتیب کے ساتھ ہمارے احاطہٗ علم میں آجائیں ۔ سائنسدان اور فلسفی دونوں اس کام کو انجام دینے میں لگے ہوئے ہیں اور ان کی کوششوں سے روز بہ روز معلوم حقائق کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے ۔ جوں جوں انکی تعداد زیادہ ہوتی جائیگی، صحیح اور سچے تصور حقیقت کے ساتھ ان کے مجموعے کی علمی اور عقلی مناسبت بڑھتی جائیگی اور ہر غلط تصور حقیقت کے ساتھ کم ہوتی جائیگی ۔ اور ہم اپنے وجدان کی شہادت کی بناء پر زیادہ آسانی کے ساتھ بتا سکیں گے کہ حقیقت کائنات کا کون سا تصور ایسا ہے جو ان حقائق کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اور کونسا ایسا ہے جو مناسبت نہیں رکھتا اور اس طرح سے ہم صحیح تصور حقیقت اور اس پر قائم ہونے والے صحیح نظام حکمت کے قریب آتے جائینگے —

ہفتم — صحیح نظام حکمت جب وجود میں آئیگا تو ابتدا میں لازماً مختصر ہوگا اور پھر جوں جوں معلوم حقائق کی تعداد بڑھتی جائیگی اور وہ اسکے اندر سماتے جائینگے تو وہ کامل سے کامل تر ہوتا جائیگا اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا نئے دریافت ہونے والے حقائق علمی کی تائید و توثیق کی وجہ سے یہ نظام حکمت روز بہ روز زیادہ مفصل اور منظم اور معقول ہوتا جائیگا ۔ اور اسی نسبت سے غلط نظام ہائے حکمت دن بہ دن اپنی معقولیت کھوتے جائیں گے حتیٰ کہ دنیا بھر میں یہ تسلیم کر لیا جائیگا کہ یہی نظام حکمت ہے جو ہر لحاظ سے درست اور تسلی بخش ہے ۔ اس نظام حکمت کے وجود میں آنے کے بعد تمام علوم کی ہر ترقی یا تو اسکی تائید کریگی یا پھر وہ کوئی ترقی ثابت نہ ہوگی —

کیا وحدت کائنات کا باعث یہ ہے کہ فی الواقع اسکا کوئی خالق ہے اور وہ ایک ہی ہے اور کیا وحدت کائنات پر انسان کے غیر شعوری وجدانی اعتقاد کا سر چشمہ اسکی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ کائنات کا کوئی خالق مانے ۔ اور وہ خالق ایک ہی ہو ۔ یہاں ان سوالات کے تحقیقی جواب کا موقع نہیں لیکن یہ گذارش کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ قرآن حکیم نے کائنات کی وحدت کی طرف پر زور الفاظ میں توجہ دلائی ہے اور اسکو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے کہ کائنات کا خالق ایک ہی ہے —

ما تریٰ فی خلق الرحمن من تفوت ؕ فارجع البصر ھل تریٰ من فطور ۔ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً و ھو حسیر ۔

آپ خدا کی تخلیق میں کہیں کوئی فرق نہ دیکھینگے — ذرا نظر لوٹائیے اور کائنات کا مشاہدہ کیجئے ۔ کیا آپ کو خدا کی اس تخلیق میں کہیں کوئی تفاوت نظر آتا ہے پھر دوبارہ نظر

دوڑائیے اور دیکھئے۔ نگاھیں مایوس
اور درماندہ ہو کر لوٹینگی کہ خدا کی
تخلیق میں کہیں کوئی تفاوت نہیں—

قل ارآیتم ما تدعون من دون اللہ اورنی ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرک فی السموات ۔

اے پیغمبر! کہئیے ۔ کیا تمھیں معلوم ھے کہ تم خدا کو چھوڑ کر کس کی عبادت کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ تو سہی کہ آیا انھوں نے زمین میں کچھ پیدا کیا ھے یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ ھے؟

یعنی اگر کائنات کی تخلیق میں خدا کے ساتھ کوئی اور شریک ھوتا تو زمین و آسمان میں کہیں تو اسکی اپنی تخلیق کا نشان ملتا جہاں جدا قسم کے قوانین قدرت نافذ ھوتے۔ظاھر ھے کہ منکرین قرآن حکیم کے اس سوال کے جواب میں اسی کائنات کا ایک حصہ پیش کرکے معقولیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ حصہ خدا کے اس شریک نے پیدا کیا ھے جسے ہم مانتے ھیں ۔ کیونکہ جب کائنات کے اس حصہ میں بھی قوانین قدرت وھی ھیں جو باقی کائنات میں ھیں تو کس طرح سے کہا جا سکتا ھے کہ اسکا خالق وھی نہیں جو باقی کائنات کا ھے—

دوسرے فلسفیوں کی طرح اقبال بھی کائنات کو اس کی رنگا رنگی اور بو قلمونی کے باوجود ایک وحدت قرار دیتا ھے۔ یہی وجہ ھے کہ اقبال کا فلسفہ دوسرے فلسفوں کی طرح ایک نظام حکمت ھے ۔ لیکن اقبال میں اور دوسرے فلسفیوں میں فرق یہ ھے کہ اقبال کے نزدیک کائنات کی وحدت کا اصول یا حقیقت کائنات جو کائنات کی کثرت کو ایک وحدت بناتی ھے۔ حق تعالیٰ کا وجود ھے ان صفات کے ساتھ جو خاتم الانبیاء کی تعلیمات میں اسکی طرف منسوب کی گئی ھیں اور دوسرے فلسفیوں میں سے ہر ایک حقیقت کائنات کا جو تصور قائم کئے ھوئے ھے وہ اس سے مختلف ھے ۔ خدا وہ اصول ھے جو پوری کائنات کو ایک کرتا ھے ۔ لہذا خدا کے عاشق کے دل میں پوری کائنات سما جاتی ھے ۔ انسانی انا ایک ھے ۔ لیکن اسکے خارجی اثرات بہت سے ھیں۔ وہ مخفی بھی ھے لیکن اسکے افعال آشکار ھیں ۔ اسی طرح سے ذات حق ایک ھے لیکن کائنات کی کثرت میں اس کا ظہور ہوا ھے ۔ ذات حق مخفی ھے ۔ لیکن کائنات کی تخلیق نے اسے آشکار بنا دیا ھے ۔ اور یہ حقیقت اسرار کائنات کو منکشف کرنے والی ھے—

ایں پستی وبا لائی ایں گنبد مینائی   گنجد بدل عاشق با ایں ھمہ پہنائی
اسرار ازل جوئی بر خود نظرے وا کن   یکتائی و بسیاری پنہانی و پیدائی

اوپر میں نے ''علمی حقیقت،، کی اصطلاح کا ذکر کیا ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم واضح کرنے کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ نہ صرف پوری کائنات ایک وحدت ہے بلکہ کائنات کی ہر چیز جسے ہم جانتے ہیں یا جان سکتے ہیں، ایک وحدت ہے ۔ یا کم از کم ہم اسے ایک وحدت ہی کے طور پر جان سکتے ہیں اور کسی حیثیت سے نہیں جان سکتے ۔ اگر وہ ایک وحدت نہ بن سکے تو ہم اسے جان بھی نہیں سکتے اور وہ ہمارے لئے قطعاً بے معنی ہے — کئی چھوٹی چھوٹی وحدتیں ملکر ایک بڑی وحدت بناتی ہیں اور پھر کئی بڑی بڑی وحدتیں ملکر اس سے بھی بڑی ایک وحدت بناتی ہیں۔ وعلیٰ ہذاالقیاس ۔ یہاں تک کہ ہم سب سے بڑی وحدت یعنی پوری کائنات پر پہنچ جاتے ہیں ۔ کوئی بڑی وحدت چھوٹی وحدتوں کا فقط ایک مجموعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک کل (Whole) کی صورت میں ہوتی ہے جو ہمیشہ اپنے اجزا یا عناصر سے بڑھ کر ہوتا ہے اور جسکی تشریح یا تفہیم فقط اسکے اجزاء یا عناصر سے نہیں ہو سکتی جیسے کہ ایک جسم حیوانی کہ وہ فقط اعضاء کے مجموعہ کا نام نہیں یا جیسے کہ ایک خوبصورت شاھکار ھنر جس کی دلکشی اسکے اجزاء پر نہیں بلکہ ایک مجموعی کیفیت پر موقوف ہوتی ہے جو اجزاء کی ترکیب کا ایک پر اسرار نتیجہ ہے ۔ کسی وحدت کو جاننے کے لئے ہمیں قدرت نے جو استعداد بخشی ہے وہ وجدان (Intuition) ہے ۔ وحدت کا وجدان ایک احساس یا اعتقاد کی صورت میں ہوتا ہے ۔ ہمارا تمام علم فقط وجدانی تصورات یا اعتقادات کے ایک سلسلہ سے مرتب ہوتا ہے اور ہمارے علم کے درست یا غلط ہونے کا سارا دار و مدار اس بات پر ہے کہ ہمارے یہ اعتقادات درست ہیں یا غلط ۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ہم حواس یا عقل کے ذرائع سے بھی جانتے ہیں اور اپنی علمی جستجو میں سائنسدان کا دار و مدار زیادہ تر حواس پر ہوتا ہے اور فلسفی کا عقل پر۔ لیکن در اصل حواس اور عقل دونوں ہمارے وجدان کے مددگار ہیں یہ خود نہ وحدتوں کو جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں بلکہ وجدان ان کی مدد سے وحدتوں کو جانتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وجدان غلطی بھی کرتا ہے لیکن جاننا بھی وہی ہے ۔اسلئے طالبان صداقت کی حیثیت سے اور معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسانوں کی حیثیت سے وجدان کے بغیر ہمارا چارہ نہیں ۔ میں جہاں بیٹھا ہوں میرے سامنے ایک رنگین پھولدار قنات لگی ہے لیکن یہ میرا وجدانی نتیجہ ہے میں قنات کو نہیں دیکھ رہا بلکہ رنگ کی ایک کیفیت کو دیکھ رہا ہوں جو میرے اعتقاد یا وجدان کی دخل اندازی کے بغیر بے معنی ہوتی ۔ اگر میں کہوں کہ میں نے اپنے آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ قنات ہے تو یہ بات قطعاً غلط ہو گی ۔ میرا یہ نتیجہ کہ وہ قنات ہے غلط بھی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ قنات نہ ہو بلکہ قنات کے پیچھے کی دیوار پر ایک نقش ہو ۔ اگرچہ میں نے اپنی طرف سے اس کل یا وحدت پر جسے میں قنات کہہ رہا ہوں

پورا غور کیا ہے اور اپنی عقل سے اسکے اندر کی چھوٹی چھوٹی وحدتوں کے باہمی تعلق کا پورا جائزہ لیا ہے اور میرا وجدان اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی وحدتیں ملکر جس بڑی وحدت کو بناتی ہیں وہ قنات ہی ہو سکتی ہے، ایک نقش نہیں ہو سکتی ۔ تاہم غلطی کا امکان موجود ہے ۔ باوجود اس بات کے کہ ہمارے حواس اپنا پوراکام کر رہے ہوتے ہیں ۔ ہم بار بار اپنے وجدان کی اس قسم کی غلطیو ں کا شکار ہوتے رہتے ہیں ۔ یہی حال میرے تمام حسی تجربات کا ہے خواہ ان کا ذریعہ دیکھنا ہو یا سننا یا چکھنا یا چھونا یا سونگھنا ۔ ان میں سے کوئی بھی میرے وجدان کے بغیر اور ایک وحدت کی صورت اختیار کئے بغیر وجود میں نہیں آسکتا ۔ قرآن حکیم بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے—

قیل لها ادخلی الصرح فلما راته حسبته لجة و کشفت عن ساقیها قال انه صرح ممرد من قواریر قالت رب انی ظلمت نفسی واسلمت مع سلیمان لله رب العلمین—

"(سورج پرست) ملکہ کو کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جائیے ۔ جب اس نے محل کے فرش کو دیکھا تو اسے گمان ہوا کہ وہ پانی ہے یہاں تک کہ اسنے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا کسی قدر سمیٹ لیا تاکہ بھیگ نہ جائے ۔ حضرت سلیمان نے کہا ۔ یہ محل تو شیشہ کا بنا ہوا ہے ۔ اس پر ملکہ نے کہا اے میرے پروردگار میں اپنی جان پر ظلم کرتی رہی ہوں لیکن اب سلیمان کی طرح اللہ رب العالمین پر ایمان لاتی ہوں—"

رب العالمین پر ایمان لانے کے لئے تو حضرت سلیمان کا پیغام پہلے ہی پہنچ چکا تھا ۔ ملکہ نے دیکھا کہ کوئی تعجب نہیں کہ جسطرح وہ شیشہ کو پانی سمجھ رہی تھی وہ اپنے معبود حقیقی کے بارہ میں بھی غلطی کا ارتکاب کر رہی ہو اور غلطی سے ہی سورج کو خدا سمجھ رہی ہو ۔ لہذا اس نے فوراً اپنے ایمان کا اعلان کیا—

اس قصہ کا ایک مقصد یہ بتانا ہے کہ نبوت ضروری باتوں میں انسان کو وجدان کی غلطیوں سے بچانے کے لئے قدرت کا ایک انتظام ہے—

جسے ہم عقل کہتے ہیں اس کا کام صرف یہ ہے کہ وجدان جن وحدتوں کو قبول کر چکا ہوتا ہے وہ ان کے باہمی تعلق کا جائزہ لے، لہذا وہ ایک وحدت سے دوسری وحدت کی طرف اور دوسری سے تیسری اور چوتھی کی طرف جاتی ہے اور ان سب کے تعلق

کو ٹٹولتی ہے تاکہ انکی مدد سے وجدان معلوم کر سکے کہ وہ کس بڑی وحدت کے عناصر ہیں ۔ عقل کا کام فقط یہ ہے کہ کسی وحدت تک پہنچنے کے لئے ہمارے وجدان کو اکسائے ۔ وہ صرف کسی وحدت کے اجزاء کے تعلقات پر غور کرتی ہے پوری وحدت کا احساس نہیں کر سکتی ۔ وحدت کا احساس یا علم اسکا وظیفہ نہیں جب ہمارا وجدان کسی وحدت کے علم تک پہنچتا ہے تو اس سے بہت پہلے عقل اس سے رخصت ہو چکی ہوتی ہے ۔ اور ہمیں پتہ بھی نہیں ہوتا ۔ عقل وہ راستہ دکھاتی ہے جو منزل کو جاتا ہے لیکن خود ہمارے ساتھ منزل پر نہیں پہنچتی ۔ منزل پر پہنچنا وجدان کا کام ہے

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے خرد کیا ہے چراغ رہ گذر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغ رہ گذر کو کیا خبر ہے

جونہی کہ ہم وحدتوں کے باہمی تعلقات کا جائزہ لینے کی بجائے کسی وحدت کا احساس کرنے لگ جائیں یا محسوس کرنے لگ جائیں کہ ہم کسی علم تک پہنچ گئے ہیں یا ہم نے کسی بات کو جان لیا ہے، ہماری عقل کی فعلیت موقوف اور ہمارے وجدان کی فعلیت شروع ہو جاتی ہے۔

کرداریت (Behaviourism) اور منطقی اثباتیت (Logical Positivism) اوراس قسم کے دوسرے سطحیت پسند فلسفے جو فلسفہ کے اس عالمگیر انحطاط کے دور میں حشرات الارض کی طرح پیدا ہو رہے ہیں ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے منکرین شعور موجدوں اور مبلغوں کی نگاہ ابھی تک انسان کے حسی تجربات کی وجدانی حقیقت پر نہیں پڑی۔ اگر ہم خودی کے اوصاف و خواص پر غور کریں تو حواس ۔ عقل اور وجدان کی ماہیت اور باہمی نسبت کے متعلق اقبال کے نقطۂ نظر کی اور وضاحت ہو جاتی ہے اورآسانی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اقبال نے کیوں وجدان کو عشق، جنون اور نظر وغیرہ ناموں سے بھی تعبیر کیا ہے۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

سپاہ تازہ بر انگیزم از ولایت عشق که در حرم خطری از بغاوت خرداست
زمانہ ہیچ نہ داند حقیقت او را جنوں قباست کہ موزوں بقامت خرداست

جب سائنسدان کے پاس نام نہاد ''مشاہداتی حقائق،، (Observed Facts) (جنکو در حقیقت ہمارا وجدان صورت پذیر کرتا ہے) کی کچھ تعداد فراہم ہو جاتی ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کی تشریح کے لئے یا بالفاظ دیگران کو منظم کرنے یا ایک وحدت بنانے کے لئے اسے ایک مفروضہ یا نظریہ کی یا ایک وجدانی یا اعتقادی تصور کی ضرورت ہے لہذا وہ اس قسم کا ایک وجدانی مفروضہ ایجاد کرتا ہے اگر یہ مفروضہ فی الواقع ان تمام حقائق کی معقول تشریح کرتا ہو یعنی ان کو منظم کرکے ایک وحدت بناتا ہو تو وہ مفروضہ بھی جب تک کہ ان حقائق کی معقول تشریح کر رہا ہو ایک ایسی ہی قابل یقین حقیقت شمار کیا جاتا ہے جیسی کہ کوئی اور علمی حقیقت جسکو سائنسدان ''مشاہدہ،، قرار دیتا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت سائنسدانوں کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کبھی مشاہدہ میں نہ آئی ہو کیونکہ اس صورت میں کوئی دوسرا مفروضہ ان حقائق کی تشریح نہیں کر سکتا اور اس مفروضہ کی جگہ نہیں لے سکتا گویا سائنسدان ایک غائب چیز کی موجودگی پر اسکے نتائج و اثرات کی وجہ سے یقین کر لیتا ہے۔ یہی ایمان بالغیب ہے جسکا ذکر قرآن میں ہے—

یو منون بالغیب (وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں)

سائنسدان پر ہی موقوف نہیں ہم سب اپنی روز مرہ کی زندگی میں مفروضات قائم کرتے رہتے ہیں یعنی بعض تصورات پر ایمان بالغیب لاتے رہتے ہیں مثلاً یہ کہ ''کل سورج طلوع ہوگا،، ''میرا دوست ایک اچھا آدمی ہے،، وغیرہ۔ اور ان ہی غائب از نظر تصورات پر ہماری ساری عملی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ہر وہ حقیقت جس پر ہم یقین کرتے ہیں شروع میں ایک مفروضہ ہی ہوتی ہے پھر جوں جوں نئے نئے حقائق منکشف ہو کر اس مفروضہ کی تائید کرتے جاتے ہیں وہ مفروضہ ہمارے لئے ایک حقیقت میں تبدیل ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس پر ہمارا یقین حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر حقائق جو آشکار ہوتے جاتے ہیں اس مفروضہ کی تائید نہ کریں تو ہم اس مفروضہ کو غلط سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی ناقابل انکار حقیقت کی ایک مثال جس پر سائنسدان ایمان بالغیب رکھتا ہے ''ایٹم،، ہے جسکو آج تک معروف معنوں میں دیکھا نہیں گیا۔ ایٹم کو ایک مفروضہ کے طور پر آج سے صدیوں پہلے پیش کیا گیا تھا لیکن ان کئی صدیوں میں ہم نے ایٹم کے نتائج و اثرات کا یعنی ان وحدتوں کا جنکو ایٹم کا وجدانی تصور ایک نئی وحدت بناتا ہے جو تجربہ کیا ہے اس نے ایٹم کو

آج ایک ناقابل انکار حقیقت بنا دیا ہے اور اس حقیقت کا علم یہاں تک موثر ہے کہ ہمیں ناگاساکی اور ہیروشیما کو آن واحد میں تباہ کرنے پر قادر بنا سکتا ہے۔ سائنسداں ایک مفروضہ کو جو اسکے ''مشاہداتی،، حقائق کی معقول تشریح کرتا ہو ''مشاہداتی،، حقائق سے کم درجہ کی علمی حقیقت نہیں سمجھ سکتا۔ وہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ''مشاہداتی،، حقائق تو سائنس ہیں لیکن یہ مفروضہ جو ان کی تشریح کرتا ہے سائنس نہیں۔ بعض وقت الگ تھلگ ''مشاہداتی،، حقائق سے زیادہ یہ مفروضہ اس کے کام آتا ہے کیونکہ اسکو اپنی علمی تحقیق اور تجسس کو جاری رکھنے کے لئے اور نئے نئے مشاہداتی حقائق کو سمجھنے کے لئے ایک بنیاد کا کام دیتا ہے اور اس مفروضہ کے بغیر اسکے مشاہداتی حقائق بھی کوئی زیادہ وقعت نہیں رکھتے—

سائنسداں وجدانی مفروضات ایجاد کرنے کی جو ضرورت محسوس کرتا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی وحدتیں ملکر ایک بڑی وحدت بناتی ہیں اور ہم کائنات کی فطرت اور اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ حقائق کو وحدتوں ہی کی صورت میں جانیں اور سمجھیں۔ ہماری یہ مجبوری سائنسداں کو زود یا بدیر ایک ایسے مرحلہ پر پہنچا دیگی جہاں اسکے دریافت کئے ہوئے حقائق کی تشریح ایک ایسے مفروضہ یا ایسے وجدانی یا اعتقادی تصور سے ہی ہو سکیگی جو پوری کائنات کے حقائق کو متحد کرتا ہو اور جب سائنسداں اس مفروضہ سے حقائق کائنات کی تشریح کریگا تو برابر ہے خواہ ہم اسے سائنسداں کہیں یا فلسفی۔ فلسفی بھی ایک وجدانی کائناتی مفروضہ کی مدد سے حقائق کائنات کی تشریح کرتا ہے۔ جو کام سائنسداں چھوٹے پیمانہ پر آج کر رہا ہے اور بڑے پیمانہ پر کل کرنے والا ہے وہ فلسفی بڑے پیمانہ پر آج ہی کر رہا ہے۔ فلسفی سائنسداں ہی کے بہم پہنچائے ہوئے آج تک کے علمی حقائق کی تشریح ایک ایسے وجدانی تصور سے کرتا ہے جو اسکے خیال میں پوری کائنات کے حقائق کو ایک وحدت بناتا ہے خواہ اسکا یہ تصور روحانیاتی ہو یا مادیاتی۔ ان معروضات سے یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ در حقیقت سائنسداں اور فلسفی میں کوئی فرق نہیں، دونوں کے کام کا دائرہ ایک ہی ہے اور دونوں کے علم کا دار و مدار بھی انسان کی ایک ہی استعداد پر ہے جسے وجدان کہتے ہیں سائنس کو اپنی ترقی کی انتہاؤں پر پہنچ کر فلسفہ بننے کے بغیر چارہ نہیں رہتا کیونکہ اگر وہ فلسفہ نہ بنے تو بے معنی ہو جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تخلیق کی تین سطحیں ہیں۔ مادہ کی دنیا، حیوانات کی دنیا اور انسانوں کی دنیا اور ان کے بالمقابل علم کے بھی تین ہی بڑے شعبے ہیں۔ طبعیات۔ حیاتیات اور نفسیات۔ اس صدی میں جو طبعیاتی حقائق دریافت ہوئے ہیں انہوں نے ماہرین طبعیات کو مجبور کر دیا ہے کہ ان کی تشریح کے لئے یہ وجدانی تصور ایجاد کریں

کہ کائنات کی آخری حقیقت شعور ہے کیونکہ یہ تصور کہ کائنات کی حقیقت مادی ہے جسے اب تک سائنسداں قبول کر رہے تھے ان نئے طبعیاتی حقایق کی تشریح کرنے سے قاصر ہے ۔ اس نظریہ کو واضح کرنے کے لئے ایڈنگٹن (Eddington) اور جیمز جینز (James Jeans) ایسے ماہرین طبعیات نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بظاہر طبعیات کی کتابیں ہیں لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ فلسفہ کی کتابیں نہیں۔ اسی طرح سے اس صدی میں جو حیاتیاتی حقائق منکشف ہوئے ہیں انھوں نے ماہرین حیاتیات کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ ان کی تشریح اسی مفروضہ سے کریں کہ کائنات کی حقیقت شعور ہے مادہ نہیں ۔ اس نظریہ کی تشریح کے لئے ہالڈین (Haldane) نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ہی (Philosophy of Biology) ہے ۔ اور پھر اس وقت نفسیات کے میدان میں جو حقائق منکشف ہو رہے ہیں وہ بھی شعور کی حقیقت پر دلالت کر رہے ہیں ۔ تاہم ان علوم کے دائرہ میں جو حقائق علمی دریافت ہوئے ہیں وہ اتنے نہیں اور نہ اس نوعیت کے ہیں کہ ان کی روشنی میں ان علوم کے ماہرین اس شعور کے اوصاف کے متعلق بھی جو اب ان کی نگاہ میں کائنات کی حقیقت ہے کوئی رائے قائم کر سکیں لیکن یہ بات ہر حالت میں نوع بشر کے علمی اور نظریاتی مستقبل کے لئے نہایت تسلی بخش ہے کہ ماہرین طبعیات، حیاتیات اور نفسیات سب حقیقت کائنات کے ایک ہی تصور پر اتفاق کرنے کے لئے ایک دوسرے کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں ۔ فلسفیوں اور سائنسدانوں کے نظریات کا بدلنا نہایت مفید اور نہایت ضروری ہے کیونکہ وہ بدل بدل کر درستی کی طرف آتے رہتے ہیں جب نئے علمی حقائق دریافت ہوتے ہیں اور کوئی نظریہ جو پرانے حقائق کی تشریح کے لئے پہلے کافی سمجھا گیا تھا ان کی تشریح کے لئے کفائت نہیں کرتا تو فلسفی اور سائنسدان دونوں مجبور ہوتے ہیں کہ اسکی جگہ دوسرا نظریہ قائم کریں جو تمام نئے اور پرانے حقائق کی تسلی بخش تشریح کرتا ہو ضروری ہے کہ اسطرح سے نظریات کے بدلنے کا نتیجہ بالاخر یہ ہو کہ ہم ایک ایسے کائناتی نظریہ پر پہنچ جائیں جو صحیح ہو اور پوری کائنات کے حقائق علمی کی تسلی بخش تشریح کرتا ہو۔

عام طورپر سمجھا جاتا ہے کہ کائنات کی عقلی توجیہہ کرتے ہوئے ایک فلسفی محض عقلی یا منطقی استدلال کے بل بوتے پر اپنے نتائج کو پہنچتا ہے اور اپنے اس استدلال میں جذبات کو رہ پانے نہیں دیتا لیکن عقلی استدلال کا یہ نظریہ درست نہیں۔ ہر فلسفی پہلے کائنات کے ان حقائق کی روشنی میں جو اسے معلوم ہوں کائنات کی حقیقت کا ایک وجدانی تصور قائم کرتا ہے ۔ پھر وہ اپنے اس تصور کی عقلی اور علمی تشریح کرنے کے لئے یعنی یہ بتانے کے لئے کہ یہی تصور ہے جو کائنات کی وحدت کا اصول ہے اور سارے حقائق کو منظم اور متحد کرتا ہے عقلی استدلال سے

کام لیتا ہے اس کا نتیجہ اسکے استدلال سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اسکا استدلال اسکے نتیجہ سے پیدا ہوتا ہے ۔ اپنا نتیجہ وہ پہلے ہی جانتا ہے اور اسکی طرف وہ اپنے استدلال کو اپنی پوری فکری قوت اور پورے زور بیان کے ساتھ موڑتا ہے ۔ کوئی فلسفی چھوٹا ہو یا بڑا اس اصول سے منحرف نہیں ہو سکتا ۔ اگر اس کا تصور حقیقت غلط ہوگا تو گویا اسکی تعمیر کی خشت اول ہی غلط رکھی گئی ۔ پھر اسکا سارا استدلال غلط ہو جائیگا یعنی اس میں جا بجا منطقی اور عقلی خامیاں پیدا ہو جائینگی ۔ اپنے استدلال کی قوت کو قائم رکھنے کے لئے کہیں تو وہ بعض سچے علمی حقائق کو جو اسکے غلط تصور حقیقت کی غمازی کرنے کی استعداد رکھتے ہوں نظر انداز کر جائیگا۔ کہیں ان حقائق کی غلط توجیہہ کریگا اور ان کو غلط سمجھیگا اور سمجھائیگا۔ کہیں ان کی اہمیت کو اتنا کم کردیگا کہ وہ اسکے تصور حقیقت کو چیلنج نہ کر سکیں اور اسکے برعکس کہیں وہ غلط علمی حقائق کو جنہیں اچھی طرح سے پرکھا نہیں گیا اور جو اسکے غلط تصور حقیقت سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں اپنے استدلال میں جگہ دیگا اور ان کی اہمیت کو اتنا بڑھائیگا کہ گویا وہی کائنات کی عقدہ کشائی کر سکتے ہیں ۔ وعلیٰ ھذا القیاس ۔ لیکن اگر اس کا تصور حقیقت صحیح ہوگا اور وہ اس تصور کو اور کائنات کے علمی حقائق کو جو اسکے زمانہ تک دریافت ہو چکے ہوں ٹھیک طرح سے سمجھتا ہوگا تو اس کا استدلال صحیح ہوگا اور یہ تمام علمی حقائق آسانی کے ساتھ اسکے نظام حکمت میں اپنی جگہ پاتے جائینگے اور وہ ان کو جہاں سے اسے مل سکینگے تلاش کرکے لائیگا اور اپنے نظام حکمت میں جگہ دیتا جائیگا ۔ کیونکہ وہ اسی کے تصور حقیقت کے ساتھ مطابقت رکھینگے اور اسی کے لئے کارآمد ہونگے ۔ اپنے استدلال کی قوت کو قائم رکھنے کے لئے اگر اسے بعض حقائق کو جنہیں علمی حقائق سمجھا جا رہا ہو بدلنا پڑیگا تو وہ اسطرح سے بدلینگے کہ ان کی خامیاں اور کمزوریاں دور ہو جائینگی اور اگر بعض کو نظر انداز کرنا پڑیگا تو وہ در حقیقت غلط اور نظر انداز کرنے کے قابل ہونگے۔ اور اگر کہیں ان کی اہمیت کو کم کرنا پڑیگا تو فی الواقع ان کی اہمیت کم ہوگی۔ اسی طرح سے اگر وہ بعض مفروضات کو اپنے نظام حکمت میں داخل کریگا تو زود یا بدیر ثابت ہو جائیگا کہ وہ محض مفروضات نہیں بلکہ تمام علمی اور عقلی معیاروں کے مطابق فی الواقع صحیح علمی حقائق ہیں ۔ گویا حقیقت کائنات کے تصور کی درستی اور درست فہمی اس کے سارے نظام حکمت کو درست کریگی اور اسکے ساتھ ہی بعض ایسے نام نہاد علمی حقائق کو بھی درست کریگی جن کی نا درستی ابھی آشکار نہ ہوئی ہو بلکہ بعض نئے درست علمی حقائق کی دریافت کی تحریک بھی کریگی ۔ اسطرح درست تصور حقیقت کی مدد سے علم اپنے ہی تراشے ہوئے بتوں کو توڑتا ہوا صداقت کی منزلوں کی طرف نکل جاتا ہے ۔ اقبال اسی بات کی طرف

اشارہ کرتا ہے جب وہ کہتا ہے:

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم کیا ہے جسکو خدانے دل و نظر کا ندیم
وہ علم کم بصری جسمیں ہمکنار نہیں تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

نہ صرف یہ کہ فلسفی جب فلسفہ لکھتا ہے تو جذبات سے الگ ہوکر نہیں لکھتا بلکہ اسکے سارے جذبات اس تصور حقیقت پر مرتکز ہوتے ہیں جس کی وہ تشریح کر رہا ہوتا ہے۔ اسے اس تصور سے عشق ہوتا ہے خواہ یہ تصور مادی ہو یا روحانی اور یہ بات ظاہر ہے اسلئے کہ جیسا کہ میں اوپر گذارش کر چکا ہوں حقیقت کائنات کا تصور ہر انسان کی عملی زندگی کی قوت محرکہ ہے اور فلسفی اس سے مستثنیٰ نہیں بلکہ وہ اسی قوت محرکہ کے زیر اثر اپنا سارا فلسفہ لکھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اسکا تصور حقیقت ہر جگہ قبول کر لیا جائے تاکہ لوگ اپنی عملی زندگی کو اسی طرح سے بنائیں جس طرح کہ وہ خود اپنی عملی زندگی کو بنانا چاہتا ہے تاکہ ان فوائد سے مستفید ہوں اور ان نقصانات سے بچ جائیں جنہیں وہ فوائد یا نقصانات سمجھتا ہے اور جن سے مستفید ہونا یا بچنا اسکی رائے میں اسکے فلسفہ کے بغیر ممکن نہیں۔ فلسفہ شعر کی طرح عشق کا اظہار ہے فلسفی جب اپنے عشق کو مقبول اذہان اور مرغوب خواطر بنانا چاہتا ہے تو سیدھی روبرو بات کہنے کی بجائے اپنے مخاطب کو بتاتا ہے کہ جس تصور کو وہ حقیقت کائنات سمجھتا ہے کیونکر تمام علمی حقائق ملکر اسکی تائید اور توثیق کرتے ہیں اور فلسفی یہ طریق گفتگو اسلئے اختیار کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ بے اثر نہ رہیگا۔ اسلئے کہ انسان کی فطرت یہ تقاضا کرتی ہے کہ اسے کوئی ایسا تصور حقیقت مل جائے جو فی الواقع تمام حقائق عالم کو منظم کرسکتا ہو اور کرتا ہو اور اس تصور کے لئے وہ بیقرار رہتا ہے۔ اقبال نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے—

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

لیکن فلسفی ایسے صحیح تصور حقیقت کو جو نہ صرف اسکے نظام حکمت کو بلکہ تمام نا درست علمی حقائق کو درست کر سکتا ہو اور نئے نئے درست علمی حقائق کے لئے معیار بہم پہنچاتا ہو کہاں سے لائے۔ ذہن انسانی حقیقت کائنات کے لا تعداد مادی اور روحانی تصورات قائم کر سکتا ہے کیونکہ اوصاف کی ذرا سی تبدیلی سے تصور بدل جاتا ہے۔ ان میں سے کون سا تصور حقیقت ایسا ہوگا جو اپنی فطرت اور اپنے اوصاف کی بناء پر حال کے علمی حقائق کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتا ہو کیوں کہ اگر ایسا تصور مل جائے تو وہ مستقبل کے حقائق کے ساتھ بھی پوری پوری مطابقت رکھیگا لیکن علمی حقائق کی تعداد ہمیشہ اسقدر

کم رہیگی کہ تنہا اپنی کوششوں سے یا فقط ان علمی حقائق کی مدد سے اس تصور کا جان لینا ایک فلسفی کے لئے بہت دشوار ہے ۔ اس قدر دشوار کہ اسے ناممکن کے درجہ میں رکھنا ضروری ہو جاتا ہے تاہم ہر ایک فلسفی نے کوشش کی ہے کہ اپنے زمانہ کے معلوم علمی حقائق کی بناء پر ایک تصور حقیقت قائم کرے اور پھر اسکی بناءپر ایک فلسفہ کی تعمیر کرےلیکن نتیجہ یہ ہے کہ ہر فلسفی کا تصور حقیقت ادھورا اور بیکار اور اسکا استدلال غلط اور نامعقول رہا ہے ۔ آج تک کوئی فلسفی ایسا نہیں ہوا جسکے استدلال کی معقولیت بجا طور پر دوسرے فلسفیوں کے شدید اعتراضات کی زد میں نہ آئی ہو ۔ فلسفیوں کے باہمی اختلافات کبھی ختم نہیں ہوتے پھر اگر کوئی فلسفی دوسرے فلسفیوں کے اعتراضات کی روشنی میں اپنے فلسفہ کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ جب غلط فلسفہ کی ایک خامی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے تو اسکے اندر اور خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں ایک فلسفی کے لئے صحیح تصور حقیقت تک پہنچنے کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں ۔ یا تو فلسفی کو کائنات کے تمام حقائق کی واقفیت فی‌الفور حاصل ہو جائے پھر وہ انکی روشنی میں بآسانی دیکھ لیگا کہ کونسا تصور حقیقت ایسا ہے جو ان حقائق سے مطابقت رکھتا ہے اور ان کو منظم کرتا ہے پھر اسکو تصور حقیقت کی فطرت اور اوصاف کا صحیح اندازہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہو گی کیونکہ اگر وہ ان حقائق کے علم کے باوجود حقیقت کا کوئی ایسا تصور قائم کریگا جو کسی پہلو سے تھوڑا سا بھی غلط ہوگا تو کوئی نہ کوئی علمی حقیقت اسکی تردید کریگی لیکن یہ امید عبث ہے ۔ دنیا کے حکماء اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ نوع انسانی کا علم قیامت تک بھی کائنات کے تمام علمی حقائق کا احاطہ نہیں کر سکتا ۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے—

قل لوکان البحر مداداً لکلمٰت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمٰت ربی ولو جئنا بمثلہ مدداً ۔

کہیے ۔ اگر سمندر کا پانی میرے پروردگار کی قدرت کے نشانات کو لکھنے کے لئے بطور سیاہی کے ہوتو پانی ختم ہوجائیگا خواہ ہم اتنا اور امداد کے لئے مہیا کردیں ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فلسفی کو کائنات کا صحیح تصور کہیں سے اتفاقاً دستیاب ہوجائے اور اس تصور کا علم اور اس کا عشق اسے یہاں تک حاصل ہو کہ وہ اس کی روشنی میں ان تمام حقائق علمی کو صحیح طور پر دیکھ اور سمجھ سکے جو آج تک دریافت ہوسکے ہیں اور ان کو اس تصور کی بنیاد پر متحد اور منظم کرسکے ۔ایسی صورت میں اگر چہ اس کے پاس حقائق علمی کم تعداد میں ہوں گے تاہم حقیقت کے صحیح اور مکمل تصور کی بنا پر وہ ان کو ٹھیک طرح سے سمجھ

سکے گا اور بتاسکے گا کہ کیوں وہ فقط اس تصور کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں ایسی صورت میں اس کا نظام حکمت ناتمام تو ہوگا لیکن غلط نہیں ہوگا اور جوں جوں حقائق علمی دریافت ہوتے جائیں گے اس کے نظریۂ کائنات میں اپنی جگہ پاتے جائیں گے اس طرح سے اس کا نظریہ کامل سے کامل تر ہوتا جائے گا اور یہ عمل قیامت تک جاری رہے گا جیسا کہ پہلے بھی گذارش کیا گیا ہے اس فلسفہ کے وجود میں آنے کے بعد فلسفہ کی تمام ترقیوں کا دارومدار نئے غلط فلسفوں کے ظہور پر نہیں بلکہ اسی فلسفہ کی زیادہ سے زیادہ ترقی اور تکمیل پر ہوگا۔ لیکن اس دوسری صورت کے وجود میں آنے کیلئے ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسری طرف سے حقائق علمی اس حدتک ترقی کرچکے ہوں کہ فلسفی اتفاقی طور پر ہاتھ لگ جانے والے اس صحیح تصور حقیقت کے ساتھ ان حقائق کی مناسبت یا مطابقت بآسانی دیکھ سکے ورنہ وہ اس تصور حقیقت کے ساتھ ان کو علمی اور عقلی طور پر وابستہ کرنے کا امکان نہ پائے گا اور کسی اور تصور حقیقت کی تلاش میں بدستور سرگرداں رہے گا۔ تاکہ فلسفی کا تصور حقیقت کائنات کے علمی حقائق سے بغلگیر ہوجائے ضروری ہوگا کہ کچھ تو اس کا تصور حقیقت ان حقائق کی طرف بڑھے اور کچھ یہ حقائق اس کے تصور حقیقت کی طرف پیش قدمی کریں —

یہاں شاید یہ سوال کیا جائے گا کہ یہ بات تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ اپنے مقصد کو پانے کے لئے ایک فلسفی کو حقیقت وجود کے صحیح تصور سے واقف ہونا چاہئے لیکن اس بات کی ضرورت کیا ہے کہ تصور حقیقت سے اسے عشق بھی ہو۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک علم وجدان سے حاصل ہوتا ہے اور وجدان عشق ہی کی ایک ابتدائی فعلیت ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ عشق وجدان ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ جب کوئی وحدت حسین و جمیل بھی ہو جیسی کہ حقیقت کائنات کی وحدت ہے (یہ بات ایک الگ بحث چاہتی ہے کہ حقیقت کائنات کے تصور کا حسین و جمیل ہونا کیوں ضروری ہے) تو وحدت کی حیثیت سے اس کا وجدان یا احساس بیک وقت اس کے حسن و جمال کا احساس بھی ہوتا ہے اور اسی احساس کا نام محبت یا عشق ہے۔ صحیح تصور حقیقت کا کامل عشق ہی اس کا کامل وجدان یا کامل علم ہے یعنی اتنا کامل علم جتنا کہ کسی شخص کی فطری استعداد معرفت اجازت دیتی ہو —

قدرت نے ہر انسان کو عشق کی ایک خاص استعداد بخشی ہے یہ استعداد بالعموم افراد کی ذہانت کی نسبت سے کم و بیش ہوتی ہے۔ کوئی چاہے تو اسے غلط تصور حقیقت کے لئے استعمال کرے اور چاہے تو صحیح تصور حقیقت کے لئے لیکن بہر حال چونکہ استعداد ایک ہی ہے جس حدتک کہ وہ اسے غلط تصور کے لئے استعمال کرے گا اس حدتک وہ صحیح تصور حقیقت کے لئے میسر نہیں آسکے گی۔

انگریزی زبان میں ایک مثل ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ کیک کھا بھی لیں اور وہ آپ کے پاس جوں کا توں موجود بھی رہے۔ جس نسبت سے خدا کے لئے ایک انسان کی محبت بڑھتی جاتی ہے باطل تصورات کی محبت اسی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ بالکل مٹ جاتی ہے۔ اس مقام پر صحیح تصور حقیقت کی محبت اتنی کامل ہوجاتی ہے جتنی کہ انسان کی فطری استعداد اجازت دیتی ہو لیکن یہ مقام بڑے مجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے —

براھیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

اگر بعض تصورات حقیقت فلسفی کی استعداد محبت کے ایک حصہ کو مصروف کئے ہوئے ہوں تو وہ ان حقائق کو کسی قدر اسی غلط محبت کی عینک سے دیکھے گا اور ان کی جو توجیہ کرے گا وہ کامل طور پر درست نہ ہوسکے گی یعنی وہ ان حقائق کو صحیح تصور حقیقت کے ساتھ ٹھیک طرح سے متعلق نہ کرسکے گا اور لہذا وہ ایک ایسا فلسفہ پیدا کرے گا جو اسی نسبت سے غلط اور ناقص ہوگا جس نسبت سے اس کی محبت غلط اور ناقص ہوگی۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے تصور حقیقت کا عشق صرف اس فلسفی کے لئے ہی ضروری نہیں جو صحیح تصور حقیقت کو اپنے فلسفہ کی بنیاد بنا رہا ہو۔ استدلال کی ظاہری قوت جو ایک غلط فلسفہ کو حاصل ہوتی ہے وہ بھی اس کے موجد فلسفی کے اس عشق کی وجہ سے ہی ہوتی ہے جو اسے اپنے غلط تصور حقیقت سے ہوتا ہے۔ اسی عشق کی وجہ سے وہ ان سچے حقائق سے آنکھیں بند کرلیتا ہے جو اس کے غلط تصور حقیقت سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اور ان غلط حقائق کو صحیح سمجھتا ہے جو اس کے تصور حقیقت سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اگر کارل مارکس کو اپنے غلط تصور حقیقت سے عشق نہ ہوتا تو وہ ہرگز ایسا فلسفہ نہ لکھ سکتا جو قطعی طور پر غلط ہونے کے باوجود آج کروڑوں بندگان خدا کی زندگیوں کا مدار و محور بنا ہوا ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایک طرف سے تو کائنات کا صحیح فلسفہ انسان کی شدید ترین نظری اور عملی ضروریات میں سے ہے اور دوسری طرف سے اس کے بہم پہنچنے کی راہ میں نا قابل عبور دشواریاں ہیں لیکن قدرت کا قاعدہ ہے کہ انسان کی ہر شدید قدرتی ضرورت کی تشفی کے لئے وہ اپنا انتظام کرتی ہے اور اس التزام کی بنیاد آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کیونکہ اس کے بغیر کائنات میں اس کے مقاصد کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ جس طرح سے قدرت ہماری شدید بدنی ضروریات کی تکمیل کے لئے بادل، ہوا، سورج، چاند، زمین اور آسمان ایسی قوتوں کو کار فرما کرتی ہے اسی طرح سے ہماری شدید روحانی ضرورت کی تشفی کے لئے انبیاء کا سلسلہ قائم کرتی ہے۔

اس چھوٹے سے مقالہ میں مظہر نبوت کے متعلق اقبال کے نظریہ کی پوری تشریح کی گنجائش نہیں اس لئے یہاں صرف اس گذارش پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ حضرت انسان کے لئے ہر نبی کا سب سے پہلا اور سب سے قیمتی تحفہ حقیقت کائنات کا صحیح تصور ہوتا ہے۔ اسی تصور کو ہم خدا کا تصور کہتے ہیں۔ اس تصور کی پوری صفات اور صحیح فطرت اس کے عملی اطلاق سے سمجھ میں آتی ہے اور اس کا عملی اطلاق جس کا ظہور نبی کی عملی زندگی کی مثال میں ہوتا ہے۔ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ انسان کی سماجی زندگی ارتقا کرکے ایک خاص درجہ پر نہ پہنچ جائے جہاں اس کے تمام ضروری قدرتی پہلو مثلاً تعلیم، قانون، سیاست، جنگ، اقتصاد، اخلاق وغیرہ پوری طرح سے نمایاں اور عام ہوجائیں۔ جونہی کہ انسانی سماج کا ارتقا اس مرحلہ پر پہنچتا ہے اس میں ایک ایسا نبی پیدا ہوتا ہے جو اپنی عملی زندگی کی مثال کے ذریعہ سے انسان کی عملی زندگی کے ان تمام ضروری شعبوں پر خدا کے تصور کا اطلاق کرتا ہے اور اس طرح سے خدا کے تصور کی صفات کے نظری اور عملی پہلوؤں کو آشکار کرتا ہے۔ وہ گویا پہلا شخص ہوتا ہے۔ جو نوع بشر کو حقیقت کائنات کا کامل تصور عطا کرتا ہے جو ایک مکمل اور آخری فلسفہ کی بنیاد بنتا ہے۔ اس نبی کے ظہور کے بعد نبوت کا اختتام ایک قدرتی بات ہے کیونکہ اس کے ظہور کے بعد اب انسان کے لئے کوئی مشکل باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنی زندگی کو ہر قسم کی درستی اور ثروت کے اعتبار سے کمال پر پہنچاسکے۔ وہ خاتم الانبیاء جنہوں نے نوع انسانی کو حقیقت کائنات کا کامل تصور عطا کیا ہے جناب حضرت محمدصلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ فلسفی جس نے علمی حقائق کی ترقیوں کے اس دور میں سب سے پہلے اپنے فلسفہ کی بنیاد نبوت کاملہ کے عطا کئے ہوئے کامل تصور حقیقت پر رکھی ہے اقبال ہے اور وہ فلسفہ جو اس دور کے علمی حقائق کو کامل تصور حقیقت کی بنیادوں پر منظم کرتا ہے فلسفہ خودی ہے۔ اقبال نے یہ دیکھ لیا ہے کہ یہی وہ تصور حقیقت ہے جو صحیح ہے اور جو تمام حقائق کائنات کو منظم کرکے ایک وحدت بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال بار بار کہتا ہے کہ وہ فلسفہ جو نبوت کاملہ کے عطا کئے ہوئے تصور حقیقت پر مبنی نہ ہو بلکہ حقیقت کے کسی ایسے تصور پر مبنی ہو جو کسی فلسفی نے حقائق عالم کی ناتمام معرفت کی بنا پر نبوت کی مدد کے بغیر خود بخود قائم کرلیا ہو بے کار اور غلط ہے اور سب فلسفے جو آج تک وجود میں آئے ہیں ایسے ہی ہیں۔ صرف خدا کا عشق ہی صحیح فلسفہ کی بنیاد بن سکتا ہے اور اس عشق کا منبع رسول کی اطاعت ہے۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا — زناری برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی — ہے اس کا طلسم سب خیالی
انجام خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری
دل درسخن محمدی بند — اے پور علی زبوعلی چند

ہیگل کے فلسفہ پر اقبال نے جو تحقیر آمیز تنقید کی ہے وہ دراصل اس کے نزدیک ہر فلسفہ پر صادق آتی ہے -

حکمتش معقول و بامحسوس در خلوت نرفت
گرچہ فکر بکراو پیرایہ پوشد چوں عروس
طائر عقل فلک پرواز او دانی کہ چیست
ماکیاں کز زور مستی خایہ گیرد بے خروس

سچا تصور حقیقت فقط خدا کا تصور ہے جو زندہ اور حی و قیوم ہے باقی تمام تصورات حقیقت ہمیشہ سے مردہ ہیں اور کبھی زندہ نہیں تھے - اور مردہ کی تصویر کشی بھی مردہ اور بے معنی ہے- وہ آج نہیں تو کل نفرت سے پھینک دی جائے گی -

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگــــر سے

بلندبال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور — حکیم سر محبت سے بے نصیب رہا
پھرافضاؤں میں کرگس اگرچہ شاھین وار — شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

حکیماں مردہ را صورت نگارند — ید موسیٰ دم عیسیٰ ندارند
دریں حکمت دلم چیزے ندید است — برائے حکمت دیگــر تپیداست

"حکمت دیگر" سے اس کی مراد وہ حکمت ہے جو نبوت کاملہ کے تصور حقیقت پر مبنی ہو- یہی وہ تصور ہے جو سچے عشق کا منبع ہے جس کی فلسفی کو ضرورت ہے- اسی عشق سے کائنات کے راز ہائے سربستہ منکشف ہوتے ہیں یہی وہ "خون جگر" ہے جس سے فلسفہ لکھا جاتا ہے اور پھر نہ مرتا ہے نہ حالت نزع میں گرفتار ہوتا ہے -

مے ندانی عشق و مستی از کجاست
ایں شعــاع آفتــاب مصطــفیٰ ست

نشان راہ زعقل هزارحیلہ مپرس — بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد

نقشے کہ بستہ‌ء همه اوهام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ‌ء دل است

بچشم عشق نگر تا سراغ او بینی   جہاں بچشم خرد سیمیاو نیرنگ‌است

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں   تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

نقطہ‌ء ادوار عالم لاالہ   منتہائے کار عالم لاالہ
لا و الا احتساب کائنات   لا والا فتح باب کائنات

حریف نکتہ‌ء توحید ہوسکا نہ حکیم   نگاہ چاہئے اسرار لاالہ کے لئے

ہر علمی حقیقت یا حکمت صرف اسی سچے فلسفہ کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے لہذا جہاں سے مل جائے اسے تلاش کرکے اس فلسفہ کے ساتھ ملحق کردینا چاہئے —

گفت حکمت را خدا خیر کثیر   ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

اقبال کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ خدا کی محبت یا عشق کے نظریہ کو ایک فلسفہ یا حکمت کی شکل دی جائے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ عام قبولیت حاصل کرسکے گا اور نہ ہی عالم انسانی کو غلط فلسفوں سے نجات مل سکے گی۔ اس قسم کا فلسفہ ایک انقلاب لائے گا اور نئی دنیا پیدا کرے گا —

غربیاں را زیر کی ساز حیات   شرقیاں را عشق راز کائنات
زیر کی از عشق گردد حق شناس   کار عشق از زیر کی محکم اساس
عشق چوں بازیر کی ہمبر بود   نقشبند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ   عشق را بازیر کی آمیز دہ

لیکن ان تمام علمی حقائق کو جو آج تک انسان کی جستجوئے صداقت پاسکی ہے حقیقت کے صحیح تصور کے ساتھ منسلک کرنے کے بعد بھی حقیقت کی تشریح اپنے کمال پر نہیں پہنچیگی۔ کیونکہ قیامت تک نئے نئے علمی حقائق دریافت ہو کر اس حقیقت کے رشتہ میں منسلک ہوتے رہیں گے اور اس کو زیادہ سے زیادہ واضح اور روشن کرتے رہیں گے۔ اسی لئے اقبال نے اپنے لیکچروں کے دیباچہ میں مشورہ دیا ہے —

” جوں جوں علم ترقی کرتا جائے گا اور فکر کے نئے نئے راستے کھلتے

جائیں گے ان ہی مطالب کی تشریح کے لئے اور تصورات اور غالباً بہتر تصورات میسر آتے جائیں گے - ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسان کی علمی ترقیوں کا جائزہ لیتے رہیں اور اپنے تصور حقیقت کی روشنی میں ان پر تنقیدی نگاہ ڈالتے رہیں — ،،

لیکن اگر کوئی شخص آج حقیقت کی معرفت تامہ کا خواہشمند ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ عبادت اور ریاضت سے حقیقت کے حسن و جمال کا ذاتی احساس یا تجربہ یا عشق پیدا کرے۔ ورنہ نہ تو کوئی دانائے راز حقیقت کی مکمل تشریح کرسکتا ہے اور نہ کوئی فرد بشر فقط اس تشریح کو سن کر یا پڑھ کر اس کی مکمل معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمع نفس
مگر تاب گفتار کہتی ہے بس
(اقبال)

رومی نے اس خیال کو بڑے زور دار الفاظ میں پیش کیا ہے :

هر چه گویم عشق را شرح و بیان — چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں
گرچه تفسیر و بیاں روشنگر است — لیک عشق بے زبان روشن تراست
چوں قلم اندر نوشتن مے شتافت — چوں بعشق آمد قلم بر خود شگافت
چوں سخن در وصف این حالت رسید — هم قلم بشکست و هم کاغذ درید
عقل در شرحش چو خر در گل بخفت — شرح عشق و عاشقی هم عشق گفت
آفتاب آمد دلیل آفتاب — گر دلیلت باید از وے رو متاب

اقبال ایسا ایک عاشق ذات فلسفی اپنے عشق کی حکیمانہ توجیہ اسی لئے کرتا ہے کہ اس کا مطالعہ کرنےوالا اس کےعشق سے بہرہ اندوز ہو اور پھر جب اسکی محبت کا چراغ جل کر روشن ہوجائے تو وہ بے اختیار عبادت اور ریاضت کی طرف متوجہ ہو اور پھر اپنے عشق کو یہاں تک ترقی دے کہ اس غرض کے لئے اسے خود حکمت کی بھی حاجت نہ رہے پہلے حکمت سے اس کا عشق پیدا ہو اور پھر اس کے عشق سے حکمت پھوٹتی اور بڑھتی اور پھولتی رہے۔ جب ہم کہیں کہ کائنات کی ہر علمی حقیقت صرف ایک تصور حقیقت کے ساتھ عقلی اور علمی طور پر وابستہ ہے اور وہ خدا کا تصور ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ خدا ہی کائنات کی سچی حقیقت ہے اسی لئے قرآن نے کائنات کی ہر علمی حقیقت کو ایک آیت یا نشان کہا ہے۔

و فی الارض ایت للموقنین ہ اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے خدا کے بہت سے نشانات ہیں

یعنی چونکہ کوئی علمی حقیقت کسی باطل تصور کائنات کے ساتھ علمی اور عقلی لحاظ سے وابستہ نہیں ہوسکتی وہ خدا کی خدائی کی ایک نشانی یا دلیل یاشہادت ہے۔

سچا فلسفہ یہی کرتا ہے، کہ جس قدر حقائق تمام نوع بشر کے احاطہ علم میں داخل ہوچکے ہوں ان کو معروف و مقبول علمی اور عقلی معیاروں کے مطابق کائنات کی سچی حقیقت سے وابستہ کرکے معلوم کائنات کے ذرہ ذرہ سے کہلواتا ہے کہ کائنات کی سچی حقیقت وہی ہے

و فی کل شیٔ له ایۃ تدل علی انه واحد

اور اس طریق سے باطل تصورات حقیقت کے حق میں تمام ممکن شہادتوں کو ملیامیٹ کردیتا ہے۔ اسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ ابھی نوع بشر کے احاطہ علم میں بہت کم حقائق عالم داخل ہوئے ہیں اس لئے کہ وہ کم ہوں یا زیادہ سب اسی کے تصور حقیقت کی تائید کررہے ہوتے ہیں اور پھر جو لوگ غلط تصورات حقیقت کے حق میں جھوٹی شہادتیں پیش کررہے ہوتے ہیں ان کا دارومدار بھی تو ان ہی حقائق کی غلط ترجمانی پر ہوتا ہے۔ جب ہماری معلوم کائنات کا ہر ذرہ بلند آواز سے اس بات کی شہادت دینے لگ جائے کہ کائنات کی سچی حقیقت خدا ہی ہے تو وہ ساتھ ہی اس بات کی بھی شہادت دے رہا ہوتا ہے کہ خدا کے سوائے تمام تصورات حقیقت باطل اور نامعقول ہیں —

ومن یدع مع اللہ الهاً اخر لابرهان له به ہ اور جو خدا کو چھوڑ کر کسی اور معبود کو پکارے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوسکتی

اور جب پوری کائنات کے اندر ایک بھی علمی شہادت کسی باطل تصور حقیقت کے حق میں باقی نہ رہے تو پھر باطل تصورات حقیقت کا باقی رہنا ناممکن ہوجاتا ہے اور پھر حقیقت کائنات کے صحیح تصور پر قائم کیا ہوا نیا سچا فلسفہ دنیا بھر میں اشاعت پذیر ہوتا ہے اور کسی مزاحمت کے بغیر دنیا کے کناروں تک پھیل جاتا ہے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ تصورات حقیقت فقط علمی دلچسپی کے نظریات نہیں ہوتے بلکہ افراد اور اقوام کی عملی زندگی کی پوری عمارتیں ان کی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہیں لہذا جب وہ علمی حیثیت سے ختم ہوجائیں تو ان تعمیرات کا منہدم ہوجانا بھی ضروری ہوتا ہے جو ان پر کھڑی ہوں اور جب ساری دنیا ہی باطل تصورات حقیقت پر تعمیر پائے ہوئے ہو تو ایسی حالت میں اس نئے سچے فلسفے کا ظہور پانا

اور اشاعت پانا جو دونوں دنیاؤں کی حقیقت کے مرغوب اور مروجہ تصورات کو باطل ثابت کرنے پر تلا ہوا ہو۔ ساری دنیا کے لئے ایک قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ باطل تصورات حقیقت کے پرستاروں میں سے کون ایسا ہوگا جو کسی فرد واحد کی ذات میں اس قیامت کو ابھرتا ہوا دیکھے اور اسے مٹانے کے در پے نہ ہوجائے۔ لہذا اس قسم کے زلزلہ خیز فلسفے کو پیش کرنا بڑی جرأت کی بات ہے جس کی توقع ہر شخص سے نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ اپنے فکر کی تلوار سے لوگوں کی دونوں دنیاؤں کو فنا کے گھاٹ اتار دینا چاہتا ہے—

حکمت و فلسفہ را ہمت مردے باید
تیغ اندیشہ بروئے دوجہاں آختن است

خوگر من نیست چشم ہست و بود
لرزہ برتن خیزم از بیم نمود

تاہم یہ قیامت آکر رہتی ہے اور جب حقیقت کے باطل تصورات مٹ رہے ہوتے ہیں اور ان کے اوپر کی عمارتیں بھی منہدم ہورہی ہوتی ہیں تو اس عمل کے ساتھ ساتھ اس نئے سچے نظام حکمت کی بنیادوں پر ایک نئی دنیا وجود میں آتی ہے جسے عاشقان جمال ذات مل کر اپنی مرضی کے مطابق تعمیر کرتے ہیں اور ان کی مرضی خدا ہی کی مرضی ہوتی ہے۔ گویا اس سے پہلے ان کے اور خدا کے درمیان یہ مکالمہ ہوچکا ہوتا ہے—

گفتند جہان ما آیا بتوسی سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ بر ہم زن

اور پھر خدا ان عاشقوں کا حوصلہ بڑھاتا ہے کہ تم جو چاہتے ہو وہی ہوگا اور تمہاری مزاحمت کرنے والے مٹادئے جائیں گے—

قدم بیباک تر نہ در رہ زیست
بہ پہنائے جہاں غیراز تو کس نیست

یہی مطلب اقبال کا ہے جب وہ صحیح تصور حقیقت پر ایک نئے فلسفہ کی تشکیل کی پر زور تحریک کرتا ہے :—

زیر کی از عشق گردد حق شناس — کار عشق از زیر کی محکم اساس
عشق چوں بازیر کی ہمبر بود — نقشبند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ — عشق را بازیر کی آمیزدہ

منکرین نبوت فلسفیوں کو آج تک اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی کائنات کی سچی حقیقت کا پورا علم نہیں ہوا۔ اگر چہ اس حقیقت کے علم کی

طرف انہوں نے کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کی ہے۔ در اصل فلسفہ اور نبوت دو مختلف راستوں سے ایک ہی منزل یعنی حقیقت عالم کی نقاب کشائی کی منزل کی طرف آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اگر چہ نبوت خاتم النبین کے ظہور سے پہلے اپنی منزل پر نہ پہنچ سکی۔ تاہم اس کی رفتار کا ہر قدم صحیح راستہ پر اٹھتا اور صحیح منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ اس کے برعکس اگر چہ فلسفہ جزوی اور محدود کامیابیاں حاصل کرتا رہا لیکن حقیقت کائنات کے صحیح وجدانی تصور سے محروم ہونے کی وجہ سے مجموعی طور پر منزل سے دور ٹھوکریں کھاتا رہا۔ نبوت کاملہ کی راہ نمائی کے بغیر صحیح قسم کے وجدان سے آغاز کرنا اور لہذا صحیح عقلی استدلال کو پانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ نبوت کی کوشش یہ تھی کہ انسان کو نظام عالم کی عقلی ترتیب کی تفصیلات میں لے جانے کی بجائے انسان کو اس کے ضروری حقائق کی واقفیت اس حد تک بہم پہنچادی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں ایسے عمل پر آمادہ ہوجائے جس سے وہ نہ صرف اپنی عملی زندگی کو درست کرے بلکہ جس سے اس کے اندر وہ صحیح وجدان پیدا ہوجائے جو نظام عالم کی عقلی ترتیب کو دریافت کرنے میں اس کی ٹھیک ٹھیک راہ نمائی کرے۔ چنانچہ نبوت اپنے کمال کو پہنچ کر بھی ہمیں نظام عالم کی عقلی واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ صرف اس اعلی قسم کے وجدان کی تربیت کا اہتمام کرتی ہے جو آخر کار اس واقفیت کے حصول کے لئے ضروری ہے اور جس کے بغیر عقلی استدلال کامل طور پر درست نہیں ہوسکتا۔ فلسفہ نے ٹھیک سمجھا کہ نظام عالم ایک زنجیر کی طرح ہے جس کی ہر کڑی اگلی کڑی کے ساتھ ایک عقلی تعلق رکھتی ہے۔ لہذا اسے یہی نظر آیا کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ سلسلہ عالم کی ساری کڑیوں کو عقل کی مدد سے دریافت کرے گا لیکن بدقسمتی سے وہ ہر بار اپنے غلط وجدان کو ہی ایک منطقی زنجیر کی شکل دیتا رہا اور لہذا ہمیشہ نا کام رہا۔ اگر فلسفہ ذرا جرأت سے قدم اٹھاتا اور نبوت کاملہ کے تصور کائنات کو جب وہ دنیا کے اندر موجود ہوچکی تھی اپنا لیتا تو اس کی پریشانیاں ختم ہوجاتیں اور وہ صحیح عقلی استدلال جو صدیوں سے اس کی جستجو کا مرکز رہا تھا اسے حاصل ہوجاتا لیکن جب تک فلسفہ اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتے چلتے نبوت کے تصور حقیقت کے قرب و جوار میں ایک خاص مقام پر نہ پہنچ جاتا یہ دلیرانہ قدم اٹھانا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ خوش قسمتی سے اس بیسویں صدی میں طبیعات، حیاتیات اور نفسیات کے اکتشافات کی وجہ سے فلسفہ کو یہ مقام حاصل ہوگیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس نے اقبال کی حکمت میں تعلیم نبوت کے ساتھ پیوست ہونے کا دلیرانہ قدم بھی

اٹھالیا ہے ۔اقبال کا فلسفہ' خودی نبوت کے عطا کئے ہوئے تصور کائنات کی ایسی تشریح بہم پہنچاتا ہے۔ جس میں آج تک کے دریافت کئے ہوئے تمام علمی حقائق سموئے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مستقبل کے علمی حقائق بھی اس کے اندر کیوں سموئے نہ جاسکیں گے ۔

تعلیم نبوت اور فلسفہ کا یہ اتصال انسان کے علمی ارتقا کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے جو نوع انسانی کو ترقی کے ایک نئے دور میں داخل کرتا ہے۔ اور اقبال اس دور کا نقیب ہے۔ اس واقعہ سے حقیقت انسان کا علم جس پر انسانی دنیا کے دائمی امن و اتحاد کا دارومدار ہے۔ پہلی دفعہ ایسی منظم صورت میں سامنے آیا ہے جو دور حاضر کے انسان کو مطمئن کرسکتی ہے اور جو اس کی عالمگیر قبولیت کی ضامن ہے۔ اقبال اپنے اس مقام سے آگاہ ہے۔ اقبال نے اپنے فکر کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ محض شاعرانہ تعلیات اور مبالغات نہیں بلکہ ایسے ٹھوس حقائق ہیں جن کے متعلق خاموشی برتنا اس کے لئے کسی طرح سے بھی جائز نہ ہوتا ۔

ذرہ ام مہر منیرآن من است | صد سحر اندر گریبان من است
خاک من روشن تراز جام‌جم است | محرم از نازادهائے عالم است
فکرم آں آہو سر فتراک بست | کو ہنوز از نیستی بیرون نجست
ہیچ کسی‌رازے کہ من گویم نہ گفت | ہمچو فکر من در معنی نہ سفت
چشمہ' حیوان براتم کردہ اند | محرم از راز حیاتم کردہ اند

بچشمم کم مبین تنہائیم را | کہ من صد کاروان در گل کنارم

قلزم یاران جو شبنم بے خروش | شبنم من مثل یم طوفان فروش
انتظار صبح خیزاں مے کشم | اے خوشا زردشتیان آتشم

عمرہا در کعبہ‌وبتخانہ مے نالد حیات | تاز بزم عشق یک دانائے راز آید برون

سر آمد روزگار ایں فقیرے | دگر دانائے راز آید نہ آید

شاید یہ کہا جائے گا کہ اگر آج تک کوئی غیر مسلم فلسفی ایسا نہیں ہوسکا جو نبوت کاملہ کے تصور حقیقت پر اپنے فلسفے کی بنیاد رکھتا تو یہ بات درست ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر اقبال سے پہلے کوئی ایک بھی مسلمان فلسفی ہو گزرا ہے تو اس کے فلسفہ کی بنیاد لازماً خدا کے اسلامی تصور پر ہوگی پھر اقبال کی خصوصیت کیا ہے اور پھر اس سلسلہ میں شاید شاہ ولی اللہ اور محی الدین ابن عربی ایسے اکابر اسلام کا نام لیا جائے لیکن خودی کی حکیمانہ اصطلاح کو کام میں

لانے کی وجہ سے اقبال کے لئے یہ ممکن ہوا ہے کہ وہ خدا کے اسلامی تصور کو محض ایک عقیدہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسی علمی اور عقلی حقیقت کے طور پر پیش کرسکے جس کے ڈانڈے دوسرے تمام علمی اور عقلی تصورات سے جاملتے ہوں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زمانہ حال کے تمام علمی حقائق کے ساتھ اور انسان کی زندگی کے تمام شعبوں کے ساتھ اس تصور کی علمی اور عقلی مناسبت آشکار ہوگئی ہے اور اس تصور کی یہ مخفی استعداد کہ صرف وہی کائنات کے تمام موجودہ اور آئیندہ حقائق کی معقول تشریح اور مکمل تنظیم کرسکتا ہے۔ علمی تحقیق کے دائرہ کے اندر آگئی ہے اور یہی اقبال کی سب سے بڑی علمی خدمت ہے۔ در اصل اقبال کی عبقریت کا یہ مظاہرہ وقت کی ضرورت کا نتیجہ ہے اور وقت کے خاص علمی ماحول اور مقام نے اسے ممکن بنایا ہے۔ اقبال کے زمانہ میں حکمائے مغرب کی تحقیق و تجسس کی بدولت علم کے تینوں شعبوں میں علمی حقائق نے اس سرعت سے ترقی کی ہے کہ اس سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دوسرے سائنس کے خاص اسلوب تحقیق کے اثر سے فلسفہ کی دنیا میں بھی ایک نیا طرز استدلال وجود میں آیا ہے۔ جس میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا جاتا ہے کہ کوئی حقائق نظر انداز نہ ہونے پائیں حقائق کا معائینہ کامل احتیاط سے کیا جائے اور نتائج وہی اخذ کئے جائیں جو ناگزیر ہوں اور یہ طرز استدلال علمی دنیا میں آئیندہ کے لئے ایک مستقل حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بہت سے فلسفے وجود میں آئے ہیں جن میں سے ہر ایک نے حقائق عالم کو ایک مرکزی تصور کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال جیسا کہ خود اسے اعتراف ہے حکمت مغرب کی ان علمی ترقیات اور خصوصیات سے پوری طرح متاثر ہوا ہے لہذا اس کی حکمت نے ایک ایسی شکل اختیار کی ہے جس کی وجہ سے اس میں صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ موجودہ اور آئیندہ کے تمام علمی حقائق کو اپنے اندر جذب کرسکے اور اس طرح سے کائنات کا وہ صحیح اور آخری نظام حکمت ثابت ہو جو ہر دور کے باطل فلسفوں کا جواب ان ہی کی زبان میں دے سکتا ہو۔ شاہ ولی اللہ اور محی الدین ابن عربی کے زمانہ میں اس قسم کے فلسفہ کا وجود میں آنا ممکن نہیں تھا۔ آج اگر مسلمان یا کوئی اور قوم جدلی مادیات کا معقول علمی جواب دینا چاہے جسے دور حاضر کا انسان بھی سمجھ سکے تو وہ صرف اقبال کے نظام حکمت ہی سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ کائنات اور انسان کی صحیح اور سچی حقیقت کو سمجھنے کے لئے نوع بشر کی راہ میں جس قسم کی ذھنی رکاوٹیں کسی دور میں پیدا ہوتی ہیں قدرت ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے علاج بھی ایسا ہی پیدا کرتی ہے۔ اقبال کا فلسفہ خودی اپنے مزاج کے لحاظ سے اپنے دور کے

فلسفوں کی تمام ظاہری خصوصیات سے حصہ لیتا ہے تاکہ ان کا تسلی بخش جواب بن سکے۔ شاہ ولی اللہ اور محی الدین ابن عربی ایسے اکابر امت کے فلسفے اپنے زمانے کے باطل فلسفوں کا جواب تھے۔ لیکن اس زمانہ کے باطل فلسفوں کا جواب نہیں ہیں اور نہ بنائے جاسکتے ہیں۔ یہی وہ حقائق ہیں جن کی بناء پر اقبال کو یہ کہنا زیب دیتا ہے :

ہیچ کس رازے کہ من گویم نہ گفت
ہمچو فکر من در معنی نہ سفت

چونکہ اقبال ایک فلسفی کی حیثیت سے وحدت کائنات کا قائل ہے ضروری تھا کہ اس کا فلسفہ ایک نظام حکمت کی صورت میں ہوتا لیکن اقبال کا نظام حکمت نثر سے زیادہ نظم میں لکھا گیا ہے اور شعر کی زبان تصورات کے باہمی عقلی اور منطقی تعلقات کی باریک تفصیلات اور جزئیات بیان کرنے کے لئے موزوں نہیں ہوتی لہذا ہم اقبال سے جس حدتک کہ وہ شعر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے ان تفصیلات کی توقع نہیں کرسکتے تھے جیسی توقع مثلاً ہم اس فلسفی سے کرسکتے ہیں جو محض نثر نویس ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا نظام حکمت ایک ہی سلسلہ کی صورت میں ایک ہی کتاب میں بیان نہیں ہوا بلکہ اس کے اجزا اس کی ساری کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ تاہم یہ اتفاق کہ اقبال ایک حکیم ہی نہیں بلکہ ایک شاعر بھی تھا اس کے فلسفہ کی نشرو اشاعت کے لئے سازگار ثابت ہوا ہے۔ شعر تصورات کو ایک انقلاب انگیز اثر کے ساتھ لوگوں کے دلوں تک پہنچاتا ہے اگر اقبال محض ایک فلسفی ہوتا اور شاعر نہ ہوتا تو شاید اس کی قوم جو علمی روایات کو مدت سے کھوچکی ہے عرصۂ دراز تک اس کے فلسفہ کی طرف توجہ نہ کرسکتی لیکن اس قوم کو اپنی بے عملی کے علاج کی فوری ضرورت تھی لہذا اس قوم کے حق میں قدرت کا انتظام یہ تھا کہ اقبال اپنے فلسفہ کو ایک نہایت ہی سریلی آواز میں گائے اور گاکر اس قوم کو فوراً اپنے اردگرد جمع کردے چنانچہ جب اس نے قوم کو اپنی آواز کی طرف بلایا —

حلقہ گرد من زنیدائے پیکران آب و گل
آتشے در سینہ دارم از نیا گان شما

تو قوم نے اس کے ارد گرد جمع ہوکر ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی جو پاکستان ہے لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہی قوم جو اس کے شعر سے متاثر ہوئی ہے اس کے شعر کے مطالب و معانی کو ایک منظم سلسلہ افکار کی صورت میں ضبط تحریر میں لائے تاکہ خود بھی اسے ٹھیک طرح سے سمجھے اور دوسروں کو بھی اس کی طرف متوجہ کرسکے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم فکر

اقبال کی اس قسم کی مسلسل تشریح بہم پہنچانے کی کوشش کریں گے تو اس کے تصورات کے آپس کے علمی اور عقلی تعلق کو آشکار کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم کسی ایک ایسی علمی حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کریں جو اس تعلق کو سمجھنے اور سمجھانے میں ہمیں مدد دے سکتی ہو یعنی جو سچی علمی حقیقت ہونے کی وجہ سے اقبال کے نظام حکمت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو، اقبال اسی خیال کی تائید کرتا ہے جب وہ کہتا ہے —

گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

فکر اقبال کی اس قسم کی منظم تشریح بہم پہنچانا نہ صرف علم کی اور نوع انسانی کی ایک بڑی خدمت ہے بلکہ غیروں کے روبرو خود اقبال کی عظمت کا بھی امتحان ہے جس میں اقبال کا پورا اترنا یقینی ہے —

یہ کہ دینا بے محل نہیں کہ جو شخص بھی اس حد درجہ ضروری کام کو ہاتھ میں لے اس کے لئے دو شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے ایک تو یہ کہ اسے اقبال کے افکار کے ذہنی یا وجدانی سر چشمہ یا منبع تک رسائی حاصل ہو یعنی وہ اقبال کے اس قلبی احساس یا وجدان سے بہرہ ور ہو جس سے اس کے تمام تصورات سرزد ہوتے ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں اسے نبوت کاملہ کے عطا کئے ہوئے حقیقت کائنات کے تصور کا وہی مشاہدہ یا روحانی تجربہ یا عشق حاصل ہو جو اقبال کو تھا ۔ افسوس ہے کہ اقبال کے غیر مبہم الفاظ میں بار بار کہنے کے باوجود ہم اس بات کو بالعموم نظر انداز کرجاتے ہیں کہ گو اقبال ایک شاعر بھی ہے اور ایک فلسفی بھی ۔ تاہم بنیادی طور پر وہ ایک درویش یا صوفی ہے اس کا شاعرانہ کمال اور حکیمانہ جوہر دونوں اس کے وجدان یا عشق کے خدمت گزار ہیں ۔ اس کی ساری ذہنی کاوشوں کا حاصل یہ ہے کہ اس نے فلسفہ کی معروف اور دور حاضر کے انسان کے لئے قابل فہم زبان میں اپنے روحانی تجربہ یا عشق کی ترجمانی کی ہے اور اس عمل کے دوران میں جو فلسفیانہ افکار و تصورات اس کے ہاتھ لگے ہیں ان کو شعر کے زور دار اور پر اثر طرز بیان کا جامہ پہنایا ہے ۔ دوسرے شاعروں کی طرح محبت مجاز کی داستانوں اور غزلوں سے سننے والوں کا دل لبھانا اس کا مدعا نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ شاعر کے لقب کو جو بعض وقت اسے دیا جاتا ہے بڑے زور سے رد کرتا ہے —

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم مثال شاعران افسانہ بستم
مدار امید زاں مرد فرد دست کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

او حدیث دلبری خواهد زمن　　رنگ و آب شاعری خواهد زمن
کم نظر بے تابئے جانم ند دید　　آشکار م دید و پنهانم نه دید

نغمه کجا و من کجا ساز سخن بهانه ایست
سوئے قطار مے کشم ناقهٔ بے زمام را

اوپر یه ذکر کیا گیا هے که کس طرح سے وه اس نتیجه پر پہنچا هے که تمام ایسے فلسفے جو خدا کی محبت یا حقیقت کائنات کے صحیح تصور سے عاری هوں اور لہذا حقیقت کے غلط یا ناقص تصور پر مبنی هوں بے هوده اور بیکار هیں - اگر وه خود خدا کی محبت سے بہره ور نه هوتا تو ممکن نہیں تھا که وه کبھی اس قیمتی حکمیانه نتیجه پر پہنچ سکتا - اور یه هارا قیاس هی نہیں بلکه خود اقبال کا دعوی بھی هے که اسے روحانیت کا ایک درجه اور معرفت حق تعالی کا ایک مقام عطا کیا گیا هے- اس درجه معرفت یا مقام محبت کو وه سوز دروں، ذوق نگاه، جان بیتاب، خدا مستی اور بادهٔ ناب وغیره الفاظ سے تعبیر کرتا هے اور اپنے لئے درویش، فقیر، قلندر ایسے القاب استعمال کرتا هے- جو صوفیا کے لئے استعمال کئے جاتے هیں-

درویش خدا مست نه شرقی هے نه غربی
گھر میرا نه دلی نه صفاهان نه سمر قند

سر آمد روز گار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید نه آید

قلندر جز دو حرف لااله کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیه شهر قاروں سے لغت هائے حجازی کا

اے پسر ذوق نگاه از من بگیر
سوختن در لااله از من بگیر

مرے کدو کو غنیمت سمجھ که بادهٔ ناب
نه مدرسه میں هے باقی نه خانقاه میں هے

عصر حاضر را خرد زنجیر پاست
جان بیتابے کہ من دارم کجا است

اعجمی مردے چہ خوش شعرے سرود
سوزد از تاثیر او جساں در وجود

اقبال کے فکر کو ایک مسلسل نظام حکمت کے طور پر پیش کرنے کے لئے دوسری شرط جس کا پورا کرنا اس کے شارح کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ تمام علمی حقائق سے جو اب تک دریافت ہوچکے ہیں اور فلسفہ کے ان تمام نظریات و تصورات سے جو آج تک پیش کئے گئے ہیں پوری طرح سے واقف ہوتا کہ اقبال کے نظام تصورات کے ساتھ ان کی اور ان کے ساتھ اقبال کے نظام تصورات کی مناسبت یا عدم مناسبت کا ادراک کرسکے۔ اقبال کا جو شارح ان دو شرطوں کو پورا کرے گا وہ اس کے نظام حکمت کے بکھرے ہوئے تصورات کے علمی اور عقلی رشتہ کو سمجھنے کی وجہ سے نہ صرف اس قابل ہوگا کہ ان کو ایک سلسلہ کی صورت میں بیان کرسکے بلکہ اس کے لئے یہ بھی ممکن ہوگا کہ وہ اس کے نظام حکمت کو اور وسعت اور ترقی دے سکے یعنی اور علمی حقائق کو جو اس کے ساتھ مطابقت یا مناسبت رکھتے ہوں اس کے اندر داخل کرکے اس کی تائید مزید کا سامان پیدا کرسکے اور یہ ظاہر ہے کہ ایک سچے تصور حقیقت پر قائم ہونے والے نظام حکمت کی ہر ترقی اس کی اگلی ترقی کو آسان کرتی ہے۔ اور اس طرح سے اس کی غیر متناہی ترقیوں کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ جب اقبال کے فلسفہ خودی کی ایک اور ترقی یافتہ صورت ہمارے سامنے آئے گی تو پھر وہ اور ترقی کرے گا اور لوگ تاقیامت اس پر لکھتے رہیں گے اور اس کی ترقی کا سلسلہ ختم نہ ہوگا کیونکہ علم کے تینوں شعبوں میں تمام حقائق صرف اسی کے اجزا و عناصر شمار کئے جائیں گے۔ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح ایک سچا فلسفہ ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے اور اس کی ترقیاں کبھی ختم نہیں ہوسکتیں اس کے برعکس چونکہ علمی حقائق ایک غلط فلسفہ کے ساتھ جو غلط تصور حقیقت پر مبنی ہو مطابقت نہیں رکھتے لہذا ان حقائق کی ترقی کی وجہ سے زود یا بدیر ایک ایسا وقت خود بخود آجاتا ہے جب غلط فلسفہ کی فرضی معقولیت کا پردہ چاک ہوجاتا ہے اور وہ اپنا دم توڑ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فکر اقبال کی اس قسم کی منظم تشریح ایک ایسے دور کو قریب لائے گی جب دنیا میں صرف ایک ہی فلسفہ باقی رہے گا اور وہ اقبال کا فلسفہ خودی ہوگا اور دوسرے تمام فلسفے یا تو مٹ جائیں گے اور

یا پھر نوع انسانی کے ادوار جہالت کی یادگار کے طور پر باقی رہیں گے۔ اسی لئے اقبال دور حاضر کے انسان سے نہیں بلکہ مستقبل کے انسان سے امید رکھتا ہے کہ وہ پوری طرح سے اس کی عظمت کا اعتراف کرے گا اور اس کے فکر کو اپنی زندگی کی بنیاد بنائے گا —

انتظار صبح خیزاں می کشم — اے خوشا زرتشیان آتشم
نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم — من نوائے شاعر فرد استم
عصر من دانندۂ اسرار نیست — یوسف من بہر ایں بازار نیست
نغمۂ من از جہاں دیگر است — ایں جرس را کاروانے دیگر است

لیکن یہ دو شرطیں اس قسم کی ہیں کہ ایسے افراد کی کوئی کمی نہ ہوگی جو ان میں سے تنہا ایک کو یا دوسری کو باحسن طریق پورا کرسکیں لیکن ایسے اشخاص بمشکل مل سکیں گے جو بیک وقت دونوں شرطوں کو پورا کریں۔ اس زمانہ میں جب مذہب علوم جدیدہ سے ناواقف ہے اور علوم جدیدہ سے شغف رکھنے والے اشخاص مذہب سے بے بہرہ ہیں ایسے دوربشان خدا مست کا وجود نادر ہے جو علوم جدیدہ میں بھی دسترس رکھتے ہوں۔

اقبال کے نظام حکمت میں خودی سے مراد وہ شعور ہے جو خود شناس ہو لیکن یہاں شعور کا مطلب تمیز یا ہوش نہیں بکہ خود وہ چیز ہے جس کا خاصہ تمیز یا ہوش ہے یا جس کی وجہ سے ایک انسان تمیز یا ہوش رکھتا ہے یہ ایک نور ہے لیکن مادی روشنیوں میں سے کوئی روشنی ایسی نہیں جو اس کی مماثل ہو اور پھر یہ ایک قوت ہے۔ لیکن مادی قوتوں میں سے کوئی قوت ایسی نہیں جس کے ساتھ اس کو مشابہت دی جاسکے ہی وہ نورانی قوت یا قوی نور ہے جس کی وجہ سے انسان زندہ ہے ان معنوں میں ایک خاص سطح کا شعور حیوان میں بھی موجود ہے لیکن حیوان کا شعور آزاد نہیں بلکہ قدرت کی پیدا کی ہوئی ناقابل تغیر جبلتوں کے ماتحت کام کرتا ہے اس کے برعکس انسان کا شعور جبلتوں سے آزاد ہوکر بھی کام کرسکتا ہے انسان میں شعور کی آزادی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں طلب حسن اور جستجو ئے کمال کا جذبہ پایا جاتا ہے اور وہ اس جذبہ کی تسکین اور تشفی کے لئے جبلتوں کی مخالفت کرسکتا ہے۔ حیوان اپنے شعور کی وجہ سے فقط سوچتا جانتا اور محسوس کرتا ہے۔ لیکن انسان اپنے شعور کی وجہ سے نہ صرف سوچتا جانتا اور محسوس کرتا ہے بلکہ جب وہ ایسا کررہا ہوتا ہے تو وہ جانتا بھی ہے کہ وہ ایسا کررہا ہے یعنی انسان میں اپنے شعور کے افعال کو جاننے اور سمجھنے کی استعداد ہے لہذا اس کا شعور خود شناس اور خود شعور ہے۔ وہ فقط شعور ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی خود شعوری ہے اسی خود شعوری کو اقبال خودی کہتا ہے۔

ہم اپنی خودی کا علم حواس کی مدد کے بغیر براہ راست حاصل کرتے ہیں۔ لیکن غیر کی خودی کا علم ہمیں فقط اس کے نتائج اور اثرات اور افعال و اعمال سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہم اس کو کسی حالت میں بھی ان آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے — اقبال کا سارا نظام حکمت علمی حقائق کی روشنی میں اسی خودی کے غیر مبدل اور فطری اوصاف و خواص اور عملی اثرات و نتائج کی تشریح پر اور اس کی روشنی میں علمی حقائق کی تشریح اور تنظیم پر مشتمل ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں حقیقت انسان و کائنات کے ہر گوشہ کو موضوع بحث بنایا ہے اور انسان کی عملی زندگی کے تمام شعبوں کی ماہیت پر رائے زنی کی ہے۔ مثلاً وہ اس قسم کے سوالات کا جواب دیتا ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے ؟ تخلیق کیا ہے ؟ ارتقا کیا ہے؟ مادہ کیا ہے؟ حیوان کیا ہے ؟ انسان کیا ہے ؟ جبلت کیا ہے؟ کیسے وجود میں آئی ہے ؟ تخیل کیا ہے ؟ حافظہ کیا ہے ؟ جد و جہد کیا ہے ؟ آرزو کیا ہے ؟ ہوش کیا ہے ؟ علم کیا ہے ؟ عقل کیا ہے ؟ وجدان کیا ہے ؟ عشق کیا ہے ؟ فقر کیا ہے ؟ موت کیا ہے ؟ اخلاق کیا ہے ؟ تعلیم کیا ہے؟ سیاست کیا ہے ؟ قانون کیا ہے ؟ آمریت کیا ہے ؟ جمہوریت کیا ہے ؟ ہنر کیا ہے ؟ تیاتر کیا ہے ؟ تاریخ کیا ہے ؟ مذہب کیا ہے ؟ جنگ کیا ہے ؟ وغیرہ لیکن اس لئے کہ یہ تمام سوالات خودی کی ماہیت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان پر قلم اٹھانا خودی کی ماہیت کو واضح کرنا ہے۔ اور اس لئے کہ اس کے نزدیک ان تمام سوالات کا صحیح جواب بھی خودی کی ماہیت سے پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ زندگی بغیر شعور کے نہیں ہوتی اور شعور بغیر زندگی کے نہیں ہوتا اقبال نے خودی کو ''زندگی،، اور ''حیات،، کے ناموں سے بھی تعبیر کیا ہے۔

خودی کا مرکزی وصف محبت یا عشق ہے اسی سے وہ اپنی ممکنات کا اظہار کرتی اور ترقی پاتی ہے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خود یست
زیر خاک ماشرار زندگی است
از محبت مے شود پا ئندہ تر
زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
از محبت اشتعال جوہرش
ارتقائے ممکنات مضمرش
فطرت او آتش اندوزد زعشق
عالم افروزی بیاموزد زعشق

خودی اپنی فطرت کے اس تقاضا کو پورا کرنے کے لئے کسی حسین و جمیل مقصد یا مدعا کی تلاش کرتی ہے اور جب کوئی ایسا مقصد یا مدعا جو اس کی نگاہ میں حسین و جمیل ہو اس کے سامنے آجاتا ہے تو پھر وہ دل و جان سے اس کو چاہتی ہے اور اس کے حصول کے لئے عواقب سے بے پرواہ ہوکر میدان عمل میں قدم رکھتی ہے اور اپنی تمام مخفی صلاحیتوں اور قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے تاکہ اپنے راستہ کی تمام مشکلات پر غالب آئے اور تمام مزاحمتوں اور رکاوٹوں کو دور کرکے اپنے مدعا کو حاصل کرے۔ مدعا کا حصول اس کا غلبہ بھی ہے اور اس کی خود نمائی بھی لہذا حبِ استیلا یا غلبہ کی خواہش اور خود نمائی اس کے ثانوی خواص ہیں جو اس کے تقاضائے عشق و محبت سے پیدا ہوتے ہیں —

زندگانی را بقا از مدعا است　　کاروانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو و ہنگامہ آرائے خودی　　موج بیتابے زدریائے خودی

اقبال کے بعض شارحین کو ''خودی،، کا یہ مفہوم سمجھنے میں دقت پیش آئی ہے اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ خودی کا لفظ فارسی اور اردو میں ایک اور معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے یعنی تکبر خود پروری اور خود پرستی کے معنوں میں اور پھر اقبال نے بھی مسلمانوں کی اس زمانہ کی پست حالی کے پیش نظر خودی کے گونا گوں ازلی اور ابدی صفات میں سے صرف اس صفت پر زور دیا ہے۔ جس کا ایک پہلو خود نمائی یا حبِ استیلا یا غلبہ کی خواہش ہے۔ اس صفت کی رو سے خودی حصول مدعا کے لئے مزاحمتوں کا مقابلہ کرکے ان پر غالب آنا چاہتی ہے۔ اس بنا' پر بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ اقبال کے نزدیک بھی خودی کا مفہوم وہی ہے یا اس کے قریب قریب کچھ ہے جو عام لوگوں کے ذہن میں اب تک چلا آتا ہے چنانچہ وہ سمجھتے ہیں کہ جذبہ' خود نمائی اور قوت کے جائز یا نا جائز اظہار میں کوئی خاص خوبی ہے اور اقبال کی تعلیم یہی ہے کہ جس طرح سے ممکن ہو اس جذبہ کا اظہار کرنا چاہئے۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی گذارش تو یہ ہے کہ جہاں تک انسان کی خودی کا تعلق ہے خودی کے مقاصد صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی۔ جد و جہد یا عمل سے خودی کا جذبہ' خود نمائی اسی صورت میں مکمل اور مستقل اطمینان پاتا ہے جب اس کا مقصد صحیح ہو یعنی اس کی اپنی فطرت کے مطابق ہو۔ غلط مدعا در حقیقت خودی کا اپنا مدعا نہیں ہوتا بلکہ اس کے اپنے اصلی فطری اور صحیح مدعا کی غلط ترجمانی ہوتی ہے جسے زود یا بدیر خودی کو درست

کرنا پڑتا ہے لہذا غلط مدعا کی پیروی سے خودی کو عارضی طور پر تسلی ہو تو ہو لیکن آخر کار اسے بے اطمینانی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی جد و جہد آخر کار خود اس کے خود نمائی کے مقصد کو شکست دے دیتی ہے۔ دوسری گذارش یہ ہے کہ عملی جدوجہد احساس مدعا کا لازمی نتیجہ ہے اور خودی ہر آن کوئی نہ کوئی مدعا غلط یا صحیح رکھنے پر مجبور ہے۔ گویا وہ ہر وقت عمل یا جد و جہد کرنے پر بھی مجبور ہے غلط مدعا غلط عمل پیدا کرتا ہے اور صحیح مدعا صحیح عمل پیدا کرتا ہے اقبال صرف اسی عمل کی تلقین کرتا ہے جو ہمارے صحیح اور بلند مدعا کے ماتحت پیدا ہو اور اس کے نزدیک صحیح مدعا فقط مرد مومن کا امتیاز ہے مومن کا نصب العین حیات صبح کی طرح روشن منتہائے حسن و کمال اور آسمان سے بالا تر ہوتا ہے کیونکہ وہ خود خدا ہی کا نصب العین ہوتا ہے

اے ز راز زندگی بیگانہ خیز　　از شراب مقصدے مستانہ خیز
مقصدے مثل سحر تابندۂ　　ماسوے را آتشی سوزندۂ
مقصدے از آسماں بالا ترے　　دلربائے دلستانے دلبرے

اوپر یہ کہا گیا ہے کہ اقبال کے نزدیک خودی وہ شعور ہے جو اپنے آپ سے آگاہ ہو اور یہ شعور انسان کا امتیاز ہے سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ خودی انسان میں کہاں سے آئی ہے۔ کیا وہ مادہ ہی کی ایک خاص ترقی یافتہ حالت کا وصف تو نہیں مثلاً مادہ کی ایسی ترقی یافتہ حالت جس کا مشاہدہ ہم وجود انسانی میں کرتے ہیں ۔ اگر یہ درست ہے تو پھر خودی مادہ ہی کی ایک شکل ہے اور مادہ سے الگ کچھ نہیں ۔ حکمائے مادیین نے یہی سمجھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جب مادہ ترقی کرتے کرتے ایک خاص حالت پر پہنچ جاتا ہے تو طبیعات اور کیمیا کے قوانین اپنا عمل اس طرح سے شروع کردیتے ہیں کہ ہم کہنے لگ جاتے ہیں کہ اس میں شعور پیدا ہوگیا ہے یا وہ زندہ ہے۔ زندہ مادہ کو ہم جسم حیوانی کا نام دیتے ہیں۔ شعور جسم حیوانی کے دماغ یا نظام عصبی میں مرتکز ہوتا ہے اور پھر جب زندہ باشعور مادہ اور ترقی کرتا ہے تو اس کا شعور بھی ترقی کرتا ہے یہاں تک کہ انسان تک پہنچ کر وہ خود شعور ہوجاتا ہے اور خود شعور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا دماغ ایک مادی ساخت کی حیثیت سے دوسرے تمام حیوانات کے دماغ کی نسبت زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ ہے اگر یہ خیال درست ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ۔ لیکن اقبال اس نقطۂ نظر سے یکسر اختلاف کرتا ہے۔ چنانچہ وہ مادہ پرست حکیم کے مسلمان پیرو سے خطاب کرکے کہتا ہے :--

تری نجات غم مرگ سے نہیں ممکن
کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکر خاکی

اقبال کے نزدیک خودی مادہ کی ترقی یا فتہ شکل نہیں بلکہ خود کائنات کی آخری حقیقت ہے جو اپنے اوصاف کو آشکار کرنے کے لئے خود مادہ کو پیدا کرکے اس میں اپنا ظہور کرتی ہے۔ اور اسے رفتہ رفتہ ترقی کے مدارج سے گزار کر ایک خاص منزل تک پہنچاتی ہے۔

پیکر ہستی زآثار خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

اور مادیین کے ساتھ اقبال کی اس نزاع میں تازہ ترین علمی حقائق کلیۃً حکمائے مادیین کے خلاف اور اقبال کے حق میں ہیں۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006